شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے

شمس الرحمٰن محسنی

سندھ ساگر اکادمی ○ لاہور

شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے

شمس الرحمٰن محسنی بی۔ اے

سندھ ساگر اکادمی
۲۰/۱۰ ریٹی گن روڈ، پوسٹ بکس ۲۰۸۵، لاہور

جولائی ۱۹۸۸ء

ناشر ———— محمد صدیق

سندھ ساگر اکادمی لاہور

مطبع ———— ایچ۔وائی پرنٹرز لاہور

قیمت ———— ۱۸ روپے

پیش لفظ

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ ولی اللہ کے یہاں اجتماعی علوم کے تمام مباحث آج کی ضروریات اور یورپ کی تحقیقات کے مطابق مکمل طور پر موجود ہیں۔ یہ بات قرینِ قیاس بھی نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحب کا زمانہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے تھا اور اس وقت سے اب تک دنیا بے شمار انقلابات سے گزر چکی ہے۔ اس عرصہ میں بہت سے نئے علوم مدوّن ہو گئے ہیں اور نئی نئی معلومات منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن ایک بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ شاہ صاحب کے یہاں اجتماعی زندگی سے متعلقہ تمام ضروری مباحث ملتے ہیں اور انہیں مشرق کی علمی تحقیقات کی منزلِ اعلیٰ کہا جا سکتا ہے۔ مشرق علومِ اجتماعی کی تحقیقات ابھی اسی قدر کرنے پایا تھا کہ زوال کا شکار ہو گیا۔ یہاں کی علمی تحقیقات زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں۔ لیکن شاہ صاحب کے نظریے آج بھی اجتماعی علوم کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ بظاہر اجتماعی کی تحقیقات کا ہمارے یہاں ایک حد تک کام ہو چکا ہے ہمیں اسے اپنا کر آگے کی طرف قدم

بڑھانا چاہیئے۔ مشرقی اقوام اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے یہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ یورپ کے ترقی یافتہ اجتماعی علوم کو بجنسہٖ قبول کرلیں۔ ایسا کرنے سے ان کی انفرادیت بُری طرح مجروح ہو جائے گی اور فرد و جماعت کی ترتیب و تشکیل کی ضروریات کے لیے اجتماعی علوم جو کام انجام دیتے ہیں وہ تشنہ رہ جائیگا ضرورت اس امر کی ہے کہ علومِ اجتماعی کا جو ذخیرہ ان کے یہاں موجود ہے وہ ان میں سے بنیادی افکار تلاش کریں۔ اور انہیں اپنے سامنے رکھ کر یورپ کی ترقی یافتہ تحقیقات سے فائدہ حاصل کریں۔ اپنے اجتماعی علوم کی نئی عمارت ان بنیادوں ہی پر اٹھائیں جو ان کی ذہنی زندگی سے مناسبت رکھتی ہیں۔

یہ وہ مرکزی خیال ہے جس کے باعث مجھے شاہ صاحب کے اجتماعی مباحث کے مطالعہ کا شوق پورا ہوا، جس کا نتیجہ شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے مجھے کن کن چیزوں نے اکسایا اس کی کہانی بڑی طویل ہے۔ مختصراً اتنا سمجھیے، مولانا عبید اللہ سندھی کا جامعہ نگر میں تشریف فرما ہونا، جامعہ کی فضا میں ہر طرف مولانا اور ان کے خیالات کا ذکر، خیر، استاد محترم پروفیسر محمد سرور صاحب کا "عبید اللہ سندھی" کے نام سے مولانا کی حیات، تعلیمات اور سیاسی افکار پر ایک سیر حاصل کتاب لکھنا، خود مولانا مرحوم کا شاہ صاحب کی تعلیمات کا تعارف کرانے کے لیے دو مختصر مگر جامع رسائل رکھنا۔ گاہے گاہے مولانا کی صحبتیں۔ یہ تھیں وہ سب باتیں جو برابر میرے شوق کو ہوا دیتی رہیں۔ یہ شوق کی انتہا تھی کہ مولانا سے سلسلۂ تلمذ شروع ہوا۔ لیکن یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے اس وقت یہ ہمت کی جب مولانا اپنے زندگی کے آخری مہینے جامعہ نگر میں گزار رہے تھے۔ مولانا کی وفات

نے اس سلسلہ کو جو ابھی ابتدائی منازل سے بھی نہ گزرنے پایا تھا۔ ختم کر دیا۔ جامعہ میں مولانا کے دو فاضل شاگرد تھے۔ مولانا محمد نور صاحب مرشد مکی اور پروفیسر محمد سرور صاحب۔ میں نے ان حضرات کی رہنمائی میں شاہ صاحب کی کتابوں کے مطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رکھا جس کی ابتدا میں مولانا کی حیات ہی میں کر چکا تھا۔

زیر نظر کتاب ان دونوں حضرات کی پیہم عنایات کا نتیجہ ہے۔ استاد محترم پروفیسر محمد سرور صاحب نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود مسودہ پر نظر ثانی فرما کر اور مقدمہ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ مجھے اعتراف ہے اگر ان کی امداد شامل حال نہ ہوتی تو شاہ صاحب کی تعلیمات کے یہ چند پہلو میں آپ کے سامنے اس وضاحت کے ساتھ نہ پیش کر سکتا۔

اصل تجویز یہ تھی کہ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں کے جن حصوں میں اجتماعی مباحث بیان کیے ہیں انہیں یکجا کر کے ان کا ترجمہ کر دیا جائے اور اس مجموعہ کے شروع میں شاہ صاحب کے عمرانی نظریات کا تعارف کرانے کے لیے ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جائے۔ اس تجویز کو عملی شکل دینے سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ اپنے ذہن میں شاہ صاحب کے اجتماعی افکار کی ترتیب دی جائے۔ اس مقصد کے لیے میں نے بہت سی یادداشتیں لکھ لی تھیں اور ان کی مدد سے مندرجہ بالا تعارف لکھنے کا ارادہ تھا۔ بعد میں یہ سوچا گیا کہ اگر کام کی تکمیل سے پہلے ان یادداشتوں کو مرتب شکل میں اہل نظر کے سامنے پیش کر دیا جائے تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ صاحب نظر اور اہل ذوق حضرات اپنا مشورہ دے سکیں گے۔ ان کے مشورہ کی موجودگی میں ہونے والا کام پہلے کے مقابلے میں بہتر طریقہ پر انجام پا سکے گا۔ زیر نظر رسالہ میں چونکہ شاہ صاحب سے متعلق چند یادداشتوں کو مرتب شکل دی گئی

ہے۔ اس لیے بعض جگہ اس میں شاہ صاحب کی کتابوں کے اقتباس اور ان کے حوالہ جات نہیں دیے جا سکے۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی غیر مناسب نہیں ہے کہ اس دوران میں میرے سامنے شاہ صاحب کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ اور خیر کثیر، مولانا عبید اللہ سندھی کی ہر دو کتب اور پروفیسر محمد سرور صاحب کی "عبید اللہ سندھی" رہی ہیں۔ میں نے ان تمام کوششوں کو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے جو شاہ صاحب کے مباحث کو اردو میں پیش کرنے کے لیے اب تک کی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر میں نے شاہ صاحب کی عبارتوں کے اردو ترجمے میں ان کتابوں ہی سے مدد لی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اہل نظر اس طالب علمانہ کوشش کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں گے اور لکھنے والے کو اپنے مفید مشوروں سے سرفراز فرمائیں گے۔

جامعہ نگر — شمس الرحمن محسنی

جولائی ۱۹۴۶ء

فہرس

مقدمہ

ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسلامی ہندوستان کے آخری دور میں ہمارے ہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب جیسے عالم اور محقق پیدا ہوئے، جنہوں نے اس عہد تک مسلمانوں میں جو بھی علوم و فنون مدون ہو چکے تھے، ان کا پورا احاطہ کیا۔ اور زوال کی طویل صدیوں میں ان میں ادھر اُدھر سے جو رطب و یابس جمع ہو گیا تھا۔ اسے کانٹا چھانٹا۔ اور ہر علم میں جو مختلف فیہ مسائل جمع ہو گئے تھے۔ اور لوگ اصل کو چھوڑ کر بس ان میں ہی اُلجھ کر رہ گئے تھے، ان کو حل کیا اور پھر ایک علم کا دوسرے علم سے اور اہل علم کے ایک گروہ کا دوسرے علم والوں سے جو تضاد اور بیر چلا آتا تھا۔ اسے دور کیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی علمی و ذہنی وراثت کو اس کے داخلی تناقضات سے پاک کر کے اس میں ایسی وحدت اور ہم آہنگی پیدا کر لی کہ بعد میں آنے والے اس وراثت کو اپنے فکر و عمل کا اساس بنا سکتے ہیں۔

یہ کام بڑا ہی مشکل تھا۔ گیارہ سو برس کی تاریخ کی پیچ در پیچ گرہوں کو سلجھانا

جب کہ ہر گروہ ایک نئے فرقے کے بننے کا باعث بن چکی ہو اور اس کے حق بجانب ہونے میں عقل و منطق کے ساتھ ساتھ قرآن اور روایات کی سند بھی موجود ہو، بڑے جان جوکھوں کا کام تھا اور یہ شاہ صاحب ہی کا دل و دماغ تھا کہ وہ اس کٹھن مہم کو کامیابی سے سر کر سکے اور ہمارے لیے اپنے ماضی کو سمجھنا اور اس سے استفادہ کرنا اتنا آسان کر گئے۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ شاہ صاحب سب سے پہلے ایک عالم دین تھے۔ ان کا منصب ایک مرشد اور معلم کا تھا۔ اور ان کی ساری زندگی بھی ارشاد و تعلیم ہی میں گزری۔ بے شک انہوں نے اور علوم پر بھی کتابیں لکھیں اور ممکن ہے وہ طلبہ کو اور فنون کی بھی تعلیم دیتے رہے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ان کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہ صاحب کا اصل مقصد لوگوں کو دین سکھانا اور انہیں اسلام کی تعلیم دینا تھا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا اسی غرض سے لکھا کہ دینی حقائق کے ثبوت میں مزید شواہد فراہم کریں۔ اور دین اور حکمت میں جو تناقض پایا جاتا تھا، حکمت ہی کی مدد سے اس کو دور کریں۔

شاہ صاحب کو سمجھنے کے لیے یہ مسئلہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہ دین کو زندگی کی اصل غایت قرار دیتے ہیں۔ اور اسی نظر سے وہ زندگی کو دیکھتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم شاہ صاحب کے یہاں جو دین کا تصور ہے اس کی حقیقت جان لیں تو گویا شاہ صاحب کے جملہ افکار کا اساسی نقطہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ اب صورت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک دین کا تصور بڑا وسیع اور جامع ہے۔ وہ زندگی کی طرح اسے بھی ایک ہمہ گیر حقیقت مانتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دین زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے اور یہ مقصد اتنا ہی عام اور عالمگیر ہے جتنی کہ خود زندگی۔ جس طرح

زندگی اجزاء اور افراد میں منقسم ہونے کے باوجود اپنا کلی وجود باقی رکھتی ہے اسی طرح شاہ صاحب کے نزدیک دین بھی ہزارہا ہزار مذاہب اور مسالک میں بٹ کر اپنی وحدت قائم رکھتا ہے۔ شاہ صاحب دین اور دین کے مظاہر میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین اصل ہے اور وہ شروع سے آخر تک یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک اپنے عمومی مقاصد کے لحاظ سے اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔ البتہ زمانے کے ساتھ دین کی ظاہری شکلیں ضرور بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن دین کی اس اصل میں جو غیر متبدل ہے اور اس کی مختلف شکلوں میں جو بار بار بدلا کرتی ہیں اکوئی تضاد نہیں۔ شاہ صاحب اپنی کتابوں میں بار بار اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان اگر اس مسئلہ کو اچھی طرح سے سمجھ جائے تو دنیا میں یہ جتنے اختلافات نظر آتے ہیں ان سب کی حقیقت اس پر کھل جائے اور وہ اس کثرت میں ایک ہی وحدت کو کارفرما دیکھنے لگے۔

اوپر کے اس بیان سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ شاہ صاحب ایک عالم دین ہیں اور انہوں نے ایک عالم دین ہی کی حیثیت سے زندگی کو دیکھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دین کا تصور اور ارباب دین سے مختلف ہے اور دین کو وہ اتنا تنگ اور محدود نہ سمجھتے ہوں جتنا عام طور پر اہل مذاہب اسے سمجھتے چلے آتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی، لیکن اس سے تو کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ شاہ صاحب کا زندگی کو دیکھنے اور اسے سمجھنے کا زاویہ نگاہ دینی ہے۔

اب جہاں تک دین کا تعلق ہے، وہ خواہ کسی شکل میں بھی ہمارے سامنے آئے، اس میں ان دو بنیادی خصوصیتوں کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ ایک تو

یہ کہ دین کسی طرح بھی زندگی کو محدود نہیں مانتا۔ زندہ موت پر زندگی کو ختم کرتا ہے اور نہ اس کے نزدیک کوئی زمانہ ایسا گزرا ہے، جب کہ زندگی کا کوئی وجود نہ ہو۔ دین اس آب و گل میں زندگی کو محدود ماننے سے بڑی سختی سے انکار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک طبیعات کی دنیا میں جو باوجود اپنی تمام بے کنار وسعتوں کے پھر بھی ایک جزو ہے۔ زندگی جو ایک کل ہے کبھی گھر نہیں سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دین کا نقطۂ نظر ہمیشہ مابعد الطبیعیاتی ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ طبیعیات کی دنیا اس زندگی میں کچھ کم اہمیت رکھتی ہے بے شک دین کے بعض مدعی یہ بھی سمجھتے رہے ہیں، اور اس غلطی کا خمیازہ انہیں بُری طرح بھگتنا بھی پڑا ہے لیکن جہاں تک شاہ صاحب کا تعلق ہے، وہ دنیائے طبیعات کی اہمیت کے قائل ہیں، اور اسے وہ ایک زندہ ٹھوس حقیقت مانتے ہیں۔ ہر ایک سچے دین دار کی طرح ان کے عقائد کی سوتیں ان کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کے سرچشموں سے ہی پھوٹتی ہیں۔ اور ان کی کوشش یہی ہے کہ زندہ حقائق طبیعات کو جو مشاہدہ اور تجربہ کا حاصل ہے۔ اور شاہ صاحب کو مشاہدہ اور تجربہ پر پورا یقین ہے۔ اپنے مابعد الطبیعیاتی تصورات سے ہم آہنگ کریں۔

دین کی دوسری خصوصیت جو اس کے لیے ایک لازمی جزو ہے، وہ اس کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ دین کا مقصود ہمیشہ سے حصول "خیر" رہا ہے۔ "خیر" کیا ہے؟ اس کی تعبیر مختلف زمانوں سے مختلف ہوتی آئی ہے۔ لیکن خیر بحیثیت ایک نصب العین کے شروع سے ہی دین کا ضروری جزو مانا گیا ہے۔ بے شک اس "خیر" سے لوگوں نے کبھی محض اپنے کنبے کی بہتری مراد لی۔ اور کبھی اس میں انہوں نے اپنی ساری قوم کو بھی شامل کر لیا۔ لیکن بعض خدا کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جنہوں

نے ان سب حدبندیوں سے گزر کر خیر کو کل انسانیت کی بھلائی پر محمول کیا اور اسی کو دین کا اصل مقصود جانا۔ بہرحال خیر کی جو بھی تعبیر ہو کوئی دین۔ خیر کے تصور کے بغیر دین کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے ذہنی پس منظر شاہ صاحب کے جملہ افکار و تصورات کا، اور اسی کی روشنی میں ہمیں ان کے عمرانی نظریوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے عمرانیات میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ زندگی کا یہ قافلہ جو ہر دم رواں دواں ہے۔ کس منزل سے چلا، کس طرح چلا جا رہا ہے۔ کون سے قوانین اسے چلا رہے ہیں۔ اور اس کے سامنے مقصد کیا ہے؟ بے شک یہ سوال محض عمرانیات کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہر معلم اور مفکر کو خواہ وہ مذہب کا پیغامبر ہو یا اخلاقیات کا مبلغ، کسی نہ کسی حد تک اس سوال سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ بیشتر اس کی طرف صرف اجمالی اشارات کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں، کیونکہ یہ سوال دراصل ہے عمرانیات کا، اور ایک عالم عمرانیات سے ہی اس کے تفصیلی جواب کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ عمرانیات کا موضوع انسانی زندگی ہے اور انسانی زندگی کا یہ عالم ہے کہ اس کی کوئی حدبندی نہیں کی جا سکتی۔ وہ ظاہر و محسوس بھی ہے اور آنکھوں سے اوجھل بھی۔ ہماری آنکھیں اسے دیکھتی بھی ہیں اور نہیں بھی دیکھتیں۔ وہ کب سے ہے۔ اس کا مشاہدہ ناممکن ہے۔ وہ کب تک رہے گی۔ اس کا تجربہ بھی محال۔ اب زندگی غیر محدود، ورنہ حدود اس کے پیچھے نہ حد سامنے، اور ہمارے حواس محدود۔ اگر اس کو سمجھنے میں مشاہدہ اور تجربہ سے درگزریں تو نتیجہ معلوم۔ اور اگر محض مشاہدہ اور تجربہ پر اکتفا کریں تو حقیقت تک رسائی ناممکن۔ عمرانی تحقیقات میں یہ بڑی کٹھن منزل ہے اور اس کو پار کرنا بڑا ہی مشکل۔

عمرانیات پر بحث کرنے والوں میں عموماً دو رجحان پائے جاتے ہیں، ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو تجربے اور مشاہدے پر زیادہ زور دیتے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ لوگ صرف زندگی کے مادی ٹھوس مظاہر تک اپنی تحقیق کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو ہم "حقیقت پرست" کہہ سکتے ہیں۔
عمرانیات پر گفتگو کرنے والوں کا ایک دوسرا گروہ ہے، جو "علیتی" کہلاتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں پہلے سے زندگی کے چند تصورات ہوتے ہیں۔ جن کی تصدیقات پر ان کو یقین ہوتا ہے۔ وہ ان کی روشنی میں مادی مظاہر پر بحث کرتے ہیں یعنی اول الذکر گروہ افراد اور اجزا سے کل تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرا گروہ پہلے ذہن میں ایک کلی تصور متعین کرتا ہے۔ اور پھر اس کی مدد سے زندگی کے مظاہر کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سمجھنا چاہتا ہے۔ اسلامی فلسفہ کی اصطلاحی زبان میں انہیں مشائی اور اشراقی کہہ لیجئے۔ ایک ارسطو کا پیرو، اور دوسرا افلاطون کا تابع۔
شاہ صاحب اپنی کتابوں میں بار بار اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ خدا تعالٰی نے مجھے یہ توفیق بخشی ہے کہ اس زمانہ میں جو تناقضات ہیں، میں ان میں باہم مطابقت پیدا کروں۔ قدرت کی طرف سے مجھے یہ ملکہ عطا ہوا ہے۔ اور مختلف فیہ امور میں تطبیق دینے کی یہ مہم مجھے سپرد کی گئی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے سب سے پہلے فقہ میں حنفی اور شافعی مسلکوں میں جو اختلافات چلا آتا تھا۔ اس کو تطبیق کی اپنی اس خداداد قابلیت سے رفع کیا۔ پھر حدیث اور فقہ میں تطبیق دی۔ اس کے بعد شریعت اور طریقت کے تناقض کو ختم کیا۔ پھر ایک طرف طریقت میں وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود کے جو متخاصم اسکول تھے ان کو ملایا۔ اور دوسری طرف مذاہب اور ادیان

کے اختلافات کو مٹایا۔ اور ان کو ایک اساس پر جمع کیا۔ اسی طرح عمرانی بحثوں میں بھی شاہ صاحب نے مشائی اور اشراقی دونوں طریقوں کو یک جا کیا اور دونوں کی مدد سے اپنے عمرانی نظریوں کو استوار کرنے کی کوشش کی۔

یہ شاہ صاحب کا خاص کمال ہے اور اسی وجہ سے ان کے عمرانی نظریے ہماری خاص توجہ چاہتے ہیں۔ ایک جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اہل دین کا یہ حال ہے کہ وہ کلی تصورات پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف ارباب عقل کا گروہ ہے کہ وہ جزویات میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں غلطی پر ہیں اور دونوں کی حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی۔ کامل وہ ہے جو جزو سے کل تک پہنچے۔ اور کل سے جزو پر آئے۔ اور دونوں کے تضادات کو دور کرے اگر یا دوسرے لفظوں میں تحقیق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حقیقت کو پانے کے لیے مشائی اور اشراقی دونوں طرز فکر سے مدد لی جائے۔" یہ شاہ صاحب کا اپنا طریقہ ہے اور واقعی وہ اس معاملہ میں درجۂ کمال پر فائز ہیں۔

"فیوض الحرمین" میں اپنے اس دوگونہ رجحان کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: "مجھے اسباب کی طرف التفات کو ترک کرنے کے لیے کہا گیا لیکن اسباب کے معاملہ میں میری اپنی حالت یہ تھی کہ جب کبھی میں خود اپنی طبیعت کی طرف مائل ہوتا تھا تو مجھ پر عقل معاشی غالب آجاتی تھی۔ اور میں اسباب سے محبت کرنے لگتا تھا...... لیکن جب کبھی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ملاءِ اعلیٰ سے ملحق ہوتا تھا، تو یہ سارے کے سارے رذائل مجھ سے چھٹ جاتے تھے۔ اس ضمن میں مجھ سے جو عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ میں اسباب کو وسیلہ بنانا چھوڑ دوں تو اس سے یہ ہوا کہ ایک طرف تو میری طبیعت کا فطری رجحان اسباب کی طرف تھا۔ اور دوسری

طرف مجھ سے ترکِ اسباب کا عہد لیا گیا تھا۔ اب میرے اندر یہ دو متناقض چیزیں
جمع ہو گئیں۔ بات یہ ہے کہ اسباب کی تلاش انسان کو تجسس، تفکر، تجربے
اور مشاہدے کی طرف لے جاتی ہے، اور وہ اس سے اپنے ماحول کو سمجھنے
اور اس کی تسخیر میں لگ جاتا ہے۔ لیکن ترکِ اسباب انسان کو اس مادی دنیا
سے ماورا لے جاتا ہے، جہاں سے وہ مادی اغراض کے بندھنوں سے
آزاد ہو کر دنیا کو مجموعی نظر سے دیکھ سکتا اور سمجھ سکتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے
شاہ صاحب کو قدرت کی طرف سے یہ دونوں صلاحیتیں ودیعت ہوئیں۔ اور
اسی بنا پر ان کی ذات میں اس قدر جامعیت تھی کہ وہ ان سب تناقضات کو اپنے
اندر جمع کر سکے۔

• اس کائنات کی کیسے تخلیق ہوئی؟ یہ خالص مابعد الطبیعیاتی مسئلہ ہے۔ بے شک
قرآن اور حدیث میں اس بارے میں اجمالی اشارے ملتے ہیں لیکن بعد میں
جب یونانی اور نوافلاطونی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا، اور ادھر ہندستان
و ایران کے علوم بغداد میں پہنچے تو مسلمانوں میں اس موضوع پر افکار و خیالات
کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے شاہ صاحب کی ان معلومات پر نظر
ہو گی اور انہوں نے اس باب میں پہلوں کے علوم سے کافی استفادہ بھی کیا ہو گا۔
لیکن اس ضمن میں شاہ صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تخلیق کے مسئلہ کو اس
طرح پیش کرتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن اور حدیث میں جو اجمالی اشارے
ہیں ان کی وضاحت اس عہد کے فلسفیانہ افکار و خیالات سے ہو جاتی ہے۔
ان مسائل میں سب سے اہم مسئلہ انسان کی تخلیق کا ہے۔ اگر یہ کائنات
عالم اکبر ہے تو انسان کو عالم اصغر کہا گیا ہے۔ تخلیقِ کائنات کی ان تمام مابعد
الطبیعیاتی بھول بھلیوں میں دراصل پڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس عالم اصغر

کا کھوج لگایا جاتے۔ چنانچہ شاہ صاحب غائر مابعد الطبیعیاتی فضاؤں میں اس لیے پرواز نہیں کرتا کہ یہ ذہن کا کوئی دلکش مشغلہ ہے بلکہ ان تمام مابعد الطبیعیاتی بحثوں سے ان کا مقصود محض انسانی زندگی کے اس عقدۂ مشکل کو حل کرنا اور اس کی معلوم اور نا معلوم صلاحیتوں کا سراغ لگانا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک کل انسانیت کا مجموعی طور پر ذہن میں کوئی واضح تصور نہ ہو، یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا اسی لیے شاہ صاحب کو عمرانی مسائل میں مابعد الطبیعات کی بحثوں کی ضرورت پڑی۔

شاہ صاحب کی عمرانی حکمت میں تخلیق کائنات کے متعلق ان مابعد الطبیعیاتی نظریوں اور انسانی فطرت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ کل کائنات کو ایک شخص واحد مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کائنات وجود لامتناہی سے ظہور پذیر ہوئی ہے، یہی وجود جو سب کو محیط اور سب کا قیوم ہے، خدا ہے۔ اس وجود سے درجہ بدرجہ تنزلات ہوئے۔ چنانچہ پہلے عالم ارواح ظاہر ہوا، پھر عالم مثال اور اس کے بعد یہ عالم اجسام۔ شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اسی وجود لامتناہی سے کائنات کی ہر چیز ظہور پذیر ہوئی ہے۔ چیزیں جب اوپر سے نیچے آتی ہیں تو کچھ نہ کچھ اوپر کے اثرات اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ یعنی ہر چیز میں اس وجود کل کا جس سے کہ اس کا صدور ہوا ہے ایک عکس ہے۔ چنانچہ انسان میں بھی یہ عکس موجود ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جب وہ اپنے اندر غور کرتا ہے اور اپنے "انا" کے متعلق سوچتا ہے تو اسے خدا تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے، ہر جزو میں کل کا پرتو، ہر وجود میں اسی ذات کا عکس اور ہر ذرہ میں اسی کا جلوہ۔ کائنات کے بارے میں شاہ صاحب کا یہ تصور اور کے عمرانی نظریوں میں بطور ایک اساسی اصول کے ہے۔

اس عمیق حقیقت کی وضاحت کرتے ہوتے "فیوض الحرمین" میں شاہ

صاحب لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی تدلی ہوئی جس سے کہ زمینوں اور آسمانوں کی کل فضا بھر گئی۔ اس تدلی کی حقیقت عبارت ہے اس معرفت سے جو شخص اکبر (کائنات کی مثالی صورت مراد ہے) کو اپنے رب کے بارے میں حاصل ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شخص اکبر نے جب اپنے رب کو اس طرح جان لیا جیسا کہ اس کے جاننے کا حق تھا تو اس سے شخص اکبر کے ادراک میں اللہ تعالیٰ کی ایک باعظمت صورت نقش ہو گئی۔ چنانچہ جب تک شخص اکبر کا وجود قائم ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ صورت بھی اس کے اندر موجود رہے گی۔ بعد ازاں جب طبیعت کلیہ کے اندر عناصر و افلاک کا ظہور ہوا۔ تو یہ طبیعت کلیہ ان عناصر و افلاک میں اس طرح محفوظ ہو گئی جس طرح طبیعت ارضی معدنیات، نباتات حیوانات اور نوع انسانی میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اب عناصر و افلاک کے بعد جب معدنیات، نباتات حیوانات اور بنی نوع انسان معرض وجود میں آئے تو عناصر و افلاک کے طبائع ان میں منتقل ہو گئے اس ضمن میں معدنیات، نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان کی حیثیت آئینوں کی سمجھیے کہ یہ چیزیں افلاک کے خواص اور ان کی حرکات اور عناصر اور ان کے طبائع کے اظہار کا ذریعہ بن گئیں۔

"اب واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے دل کی گہرائیوں میں اس کے نفس کے جوہر میں اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالیٰ کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے۔ لیکن اس استعداد پر بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ پردے انسان کی اس استعداد پر کیسے پڑے؟ بات یہ ہے کہ انسان کے نفس کی خاصیت کچھ ایسی ہے کہ اس پر ہر ایک چیز کا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ نفس انسانی ان طبائع سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اسی قدر اس کی فطری جلا میں کمی آ جاتی ہے"

چنانچہ شاہ صاحب کے نزدیک ہدایت سے مراد انسان کے دل سے ان پردوں کو ہٹانا مقصود ہے۔ تاکہ اسے حقیقۃ الحقائق کی طرف تنبہ حاصل ہو اور

وہ یہ جان لے کہ اسی حقیقۃ الحقائق سے طبیعتِ کلیہ اور اس کے اجزاء اور انواع کا ظہور ہوا ہے۔ غرض ہ افراد انسانی کا اپنے اصل واحد کی طرف لوٹنا اسی میں ان کی سعادت ہے۔ تخلیق کے بارے میں شاہ صاحب کے تمام مابعد الطبیعیاتی نظریوں کا یہ نچوڑ ہے۔ اور یہی چیز ان کے عمرانی فلسفہ کی جان ہے۔

جب انسان دنیا میں آگیا تو وہ فطرتاً مجبور تھا کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اکیلے اس کی ضرورتیں پوری نہ ہوتی تھیں۔ اس لیئے اس نے جماعت میں رہنا پسند کیا۔ اس طرح معاشرہ یا سماج وجود میں آیا۔ جوں جوں آبادی بڑھی معاشرے کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ پہلے گاؤں بنے۔ پھر شہر وجود میں آئے۔ آگے چل کر شہروں نے مل کر ایک ریاست بنائی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک ریاست دوسری ریاست کے خلاف معرکہ آرا ہونے لگی۔ اب ا ضرورت تھی ایک ایسی ریاست کی جو ان سب کو اکٹھا رکھ سکے۔ اس قسم کی ریاست کو شاہ صاحب خلافت کا نام دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک انسانوں میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے اس طرح کی ریاست کا ہونا بہت ضروری ہے معاشرہ کے ان ارتقائی مدارج پر کم وبیش ہر اجتماعی عالم نے بحث کی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں شاہ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسانوں کی نہ صرف بدنی صحت و تندرستی کے لیے بلکہ ان کی اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے لیے بھی معاشی فارغ البالی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بار بار اپنی کتابوں میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں۔ جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے۔ اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لیے کام کریں۔ شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اگر بدن کو مناسب غذا نہیں ملتی اور انسان ہر وقت احتیاج اور تنگی کا نشانہ بنا رہتا

ہے تو لازماً اس کا اثر اس کے نفس پر پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کی اخلاقی ترقی رک جاتی ہے، اور وہ ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس کی معیشت متوازن ہو۔ اس میں نہ حد سے زیادہ امیر ہوں اور نہ حد سے زیادہ غریب۔ افراد کی زندگیوں میں معاشی اعتدال ہو، اور مادی زندگی کی جو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ وہ لوگوں کو بافراط ملیں۔ اگر معاشرہ کا ایک طبقہ بہت زیادہ امیر ہوگا تو ان کے اخلاق لامحالہ خراب ہو جائیں گے اور اس کا اثر تمام معاشرہ میں پھیلے ہوگا ۔۔ اسی طرح تباہ حال طبقوں کی فاقہ مستی بھی معاشرہ میں انتشار کا باعث ہوتی ہے۔

شاہ صاحب ایک عالم ربانی تھے۔ قدرتی بات تھی کہ ان کا موضوع بحث انسانی زندگی کا اخلاقی اور مذہبی پہلو ہوتا۔ چنانچہ وہ تھا اور شاہ صاحب کے زمانے میں ربانی عالموں کا دستور تھا کہ وہ اسباب معیشت کے بارے میں سوچنا برا سمجھتے اور نیکی اور تقویٰ کے لیے ترکِ اسباب پر بہت زور دیتے۔ ان کے نزدیک دنیا نجس تھی۔ اور دنیا کا کاروبار چلانے والے دنیا کو چھوڑنے والوں سے کم درجے پر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم شاہ صاحب کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے تمام مابعد الطبیعیاتی رجحان اور تصوف اور ریاضت سے اس قدر دلبستگی کے ساتھ ساتھ انسان کی معاشی ضرورتوں کو اپنے "عمرانی فلسفے" غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دارومدار بہت حد تک اس کی اقتصادی زندگی کے حسنِ انتظام پر ہے۔

شاہ صاحب کے اس رجحانِ فکر کی تہ میں بھی زندگی کے بارے میں یہی ان کا جامع، ہمہ گیر اور عالمگیر تصور کار فرما ہے۔ وہ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، کثرت میں وحدت کے قائل ہیں، اور چونکہ وہ ساری موجودات کو ایک اصل سے

نکلا ہوا مانتے ہیں"۔ اس لیے اُن کے خیال میں ہر شے دوسری شے سے متعلق ہے
اور ایک کا اثر دوسری پر پڑتا ہے۔ مادہ اور رُوح ان کے نزدیک ایک ہی حقیقت
کے دو رُخ ہیں۔ ایک قدرے کثیف اور دوسرا اس سے لطیف تر۔ لیکن چونکہ اُن
کے خیال میں "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" اس لیے اگر اخلاق
سدھارنا ہے تو اقتصادی زندگی کو ٹھیک کیجئے اور اگر اقتصادی زندگی کو بہتر
بنانا ہے تو انسانی اخلاق کو درست کیجئے۔ دونوں چیزیں ایک دوسرے
کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کو چھوڑ کر محض دوسری کے پیچھے پڑ جانا سراسر
نادانی ہے۔

اس مسئلہ خاص میں عملاً شاہ صاحب آج کے مادی فلسفیوں سے زیادہ
دور نہیں ہیں، البتہ نظری لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ شاہ صاحب مادی
زندگی کو جیسے کہ وہ نظر آتی ہے، مانتے ہیں۔ اور اس میں علت و معلول، سبب و
نتیجہ، فعل و ردِ فعل اور تدبیر و سعی کا جو فطری توازن کارفرما ہے اس کے اتنے
ہی قائل ہیں، جتنا کہ آج کا کوئی عالمِ طبیعیات ہو گا۔ لیکن ان کا عقیدہ یہ ہے
کہ یہ مادی کائنات یوں ہی وجود میں نہیں آ گئی۔ اور نہ یوں ہی یہ معدوم ہو جائے
گی۔ اس کے وجود میں آنے کا بھی کوئی سبب ہے اور اس کے ختم نہ ہونے
کی بھی معقول وجہ۔ زمان و مکان کی اس وسعت لامتناہی کو انسانی ذہن سے
قریب کرنا ان کے فلسفیانہ نظام کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی سے وہ اپنے
عمرانی نظریوں کی تعمیر کا کام لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ماوراء مادہ کی یہ تمام بحثیں نظری حیثیت رکھتی
ہیں اور بقول بعض لوگوں کے یہ محض دماغی عیاشی اور مجذوب کی بڑ ہیں۔ جس
شخص کی نظر اس مادی دنیا کی محدود وسعتوں سے آگے نہ گزر سکے اس کا یہ

کہنا بے شک حق بجانب ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کو قدرت نے اتنی بصیرت دی ہے کہ وہ اس محدود مادی زندگی کی غیر محدود ازلی اور ابدی وسعتوں کو بھی دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ مادی زندگی کے سلسلۂ نظم و نسق کو بھی مانتا اور اس کو ناقابلِ انکار حقیقت سمجھتا ہے اور پھر علت و معلول کے اس سلسلہ کو ماورائے مادہ کی مابعد الطبیعیاتی بحثوں سے الجھنے نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی وجہ سے اس کے نظامِ فکر میں ایک کو دوسرے سے تقویت ملتی ہے۔ تو ظاہر ہے ایسے شخص کے نظریے اہلِ علم کے لیے ضرور قابلِ توجہ سمجھے جائیں گے۔

نظامِ کائنات میں علت و معلول کے اس ناقابلِ شکست سلسلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ شاہ صاحب لکھتے ہیں "علتِ تامہ یعنی وہ علت جس کا لازمی نتیجہ اس سے معلول کا صدور ہو، اس علتِ تامہ کا علم اس امر کی کفالت کرتا ہے کہ معلول کا علم بھی حاصل ہو گیا۔ اب جہاں تک اشیائے عالم کا تعلق ہے۔ وہ سب کی سب اس طرح وجودِ الٰہی میں موجود تھیں۔ ہر شے کے مقابل ذاتِ واجب کا ایک کمال اور اس کا اقتضائے ذاتی ہوتا ہے۔ اور ذاتِ واجب کے یہی وہ کمالات ہیں جو اشیا کے ظہور کا منبع بنے۔ الغرض یہ سب کی سب اشیاء معلولات ہیں! اس ذاتِ واجب کی علتِ تامہ کی اور اسی سے ان سب کا صدور ہوا ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے وہ معلول ہے ذاتِ واجب کی، جو چیز معلول نہیں یعنی اس کی کوئی علت نہیں تو اس چیز کا متحقق ہونا بھی ممکن نہیں۔ شاہ صاحب لاشی سے شے کا ہونا نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک عدم سے عدم ہی پیدا ہوتا ہے۔ وجود کے لیے تو کوئی علت چاہیئے۔ ایجادِ عالم میں علت و معلول کے اس ناگزیر رشتہ کو ثابت کرنے

کے بعد وہ انسانی افعال پر آتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: انسانوں کے افعال کے جو اسباب ہیں ان اسباب کی بھی اپنی علتیں ہوتی ہیں۔ اور ان علتوں کا سلسلہ برابر آگے چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں یہ وجوب قطعی پر ختم ہوتا ہے مختصراً یہ افعال صادر تو بندوں کے ارادوں سے ہوتے ہیں، لیکن ان افعال کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی ایجاد ہے۔ اس ضمن میں یہ ملحوظ رہے کہ انسان کا ارادہ بھی ان افعال کے اسباب کے لیے بطور ایک امر واجب کے ہے.......

مظاہر کائنات اور افعالِ انسانی کو سمجھنے کے لیے شاہ صاحب کا یہ اساسی فکر ہے اور عمرانیات میں وہ اسی اصول کو کار فرما ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے عمرانی نظریات میں علت و معلول کا یہ سلسلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہ صاحب کے عمرانی فکر میں ایک اور چیز کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ عالم مثال کا مسئلہ ہے۔ شاہ صاحب افلاطون کی طرح عالمِ مثال کو مانتے ہیں۔ عالمِ مثال کیا ہے، اس کی تفصیل میں جانا تو یہاں ممکن نہیں۔ البتہ مختصراً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک تو یہ عالمِ اجسام ہے۔ اور دوسرا شاہ صاحب کے نزدیک عالمِ ارواح ہے۔ اول الذکر سرتا پا محسوس اور مشہود اور دوسرا بالکل مجرد۔ ان دونوں کے بیچ میں عالم مثال ہے۔ جس میں عالمِ اجسام اور عالمِ ارواح دونوں کی خصوصیات موجود ہیں۔ اس عالمِ مادی میں جو کچھ ہے، اس کی اصل عالمِ مثال میں موجود ہے۔ گویا اشیاء کی مادی صورتیں نقل ہیں عالم مثال کی تمثالی صورتوں کی۔ ایک عکس ہے اور دوسری اصل۔ ایک کامل اور دوسری اس کی ناقص تصویر۔ آخر الذکر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اس کامل نمونے سے قریب تر ہو۔ جس کا مثالی پیکر عالم مثال میں موجود ہے۔ خود شاہ صاحب کے اپنے الفاظ میں "ہر ذی روح نفس جو اس عالم اجسام میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس

کی اس عالم سے خارج میں ایک مثالی صورت ہوتی ہے، اور وہ بزرگی اسی صورت کو اپنی سند اور نصب العین بناتی ہے۔"

چنانچہ شاہ صاحب کے نزدیک اچھا معاشرہ وہ ہے جو معاشرہ کی اس مثالی صورت سے جو عالم مثال میں قائم ہے زیادہ سے زیادہ مشابہ ہو۔ یہ ارضی معاشرہ جس قدر بھی اس مثالی معاشرہ سے قریب تر ہوگا، شاہ صاحب کے خیال میں اسی قدر وہ کامل تر ہوگا۔ یہی حال افراد کا ہے۔ ان کے نزدیک اچھا فرد وہ ہے جو فرد کے اس مثالی پیکر سے جو عالم مثال میں ہے زیادہ ملتا ہوا ہو، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہم اسی تصویر کو اچھا کہتے ہیں جو اصل سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے۔ اور سب سے اچھی تصویر وہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں اور اصل میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان کو اس مثالی پیکر کمال تک کس طرح رسائی ہو۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان جب اپنی حیوانی عادات کی آلودگیوں اور جسم کی شہوانی کیفیات کی آلائشوں سے تجرد اختیار کرتے ہیں۔ تو وہ فوراً حظیرۃ القدس میں پہنچ جاتے ہیں۔ حظیرۃ القدس کو یوں سمجھئے جیسے کہ ہمارے جسم کے مقابلہ میں روح ہے، اسی طرح اس عالم جسمانی سے اوپر حظیرۃ القدس کا عالم ہے۔ اس مقام میں انسانوں پر خدا تعالیٰ کے جلال کی تجلی ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں یہ حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جسم کی مادی سرحدوں سے آگے گزر کر جب انسانی ذہن عالم معانی میں پہنچتا ہے تو وہاں اس کو اس آئیڈیل معاشرہ کا ادراک ہوتا ہے۔ اس عالم جسمانی سے اس عالم معانی تک رسائی عقل کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کے لیے نفس کی پوشیدہ وجدانی قوتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اس

مثالی معاشرہ کو اپنا نصب العین بنائیں۔ اسی میں افراد کی سعادت اور معاشرہ کی بہبودی ہے۔ یہ ہے شاہ صاحب کا تصور "خیر" اور اسی "خیر" تک پہنچنے کی جدوجہد ان کے ہاں انسانیت کا کمال ہے۔ شاہ صاحب کے عمرانیات سے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی اسے آخری کڑی سمجھنا چاہیئے۔

شاہ صاحب کے عمرانی نظریوں اور جن فکری بنیادوں پر یہ نظریئے قائم ہیں، ان کا سرسری ذکر ہو چکا۔ اس سلسلہ میں ایک دو اور باتوں کا ذکر کر کے اب ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ قارئین کو یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ شاہ صاحب جس زمانے میں پیدا ہوئے، اس زمانے کی علمی فضا میں یونانی افکار رچے ہوئے تھے۔ مدرسوں میں، مسجدوں میں، شاہی درباروں میں اور خانقاہوں میں یونانی فلسفہ جو عربی لباس میں آ کر نیم اسلامی بن چکا تھا، علم و دانش کا معیار کمال سمجھا جاتا تھا۔ قدرتی بات تھی کہ شاہ صاحب بھی اس فلسفے کو پڑھتے اور کم یا زیادہ اس سے متاثر ہوتے۔ ایسا ہونا نہ خلاف عقل ہے اور نہ اس سے ان کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ ہر زمانے کی اپنی زبان اور ہر عہد کا اپنا ذہن ہوتا ہے شاہ صاحب کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اس زمانے میں پیدا ہوتے اور اس زمانے کی زبان نہ بولتے، یا اس عہد میں ہوش سنبھالتے اور اس عہد کے ذہن سے بے اثر رہتے۔ بے شک انہوں نے وہ فلسفہ پڑھا ہوگا۔ لیکن چونکہ ان کی طبیعت کو فطرتاً تقلید سے اِبا تھا، اور پھر ان کو حالات بھی ایسے ملے تھے کہ وہ مذہب کے معاملے میں تو شاید تقلید گوارا کر لیتے لیکن اس عہد کے فلسفیانہ خیالات کو وہ آنکھ بند کر کے کسی طرح قبول نہیں کر سکتے تھے۔ اکبر کا زمانہ جس میں حکمت و فلسفہ شاہی سرپرستی کے طفیل تقلیدی مذہب سے بازی لے جانے میں کامیاب ہوا کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کے خلاف سخت

ردِ عمل ہوا تھا۔ اور یقیناً شاہ صاحب اور ان کے والد اس ردِ عمل سے ضرور متاثر ہوتے ہوں گے۔

دوسری چیز جس نے ہمارے خیال میں شاہ صاحب کو اس زمانے کے اہلِ علم کی عام روش سے نکال کر جدت اور اختراع اور آزادیٔ فکر کی راہوں پر ڈالا، وہ ان کا حجاز کا سفر تھا۔ حجاز میں شاہ صاحب نئے نئے لوگوں سے ملے اور انہوں نے مختلف مشائخ سے استفادہ کیا لیکن سب سے بڑی چیز جو ان کو اس سفر میں میسر آئی ہمارے نزدیک وہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی بعض تصنیفات کا مطالعہ تھا۔ شیخ الاسلام آزادیٔ فکر کے بہت بڑے امام تھے۔ انہوں نے یونانی فلسفہ کی فرسودگی اور مذہبی جمود کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی اور جس کی گونج آج بھی عالمِ اسلام کے ہر حصہ میں سنائی دیتی ہے، ناممکن تھا کہ شاہ صاحب شیخ الاسلام کی کتابیں پڑھتے اور ان سے متاثر نہ ہوتے۔

مسلمانوں کے ہاں یونانی فلسفہ زندگی کے اس اتار چڑھاؤ میں سے گزر رہا تھا کہ شاہ صاحب نے وجود، مظاہرِ وجود، تخلیقِ کائنات، اجتماعیات اور اس طرح کے دوسرے فلسفیانہ مسائل پر قلم اٹھایا۔ ظاہر ہے انہوں نے جہاں تک ممکن تھا یونانی فلسفہ کی دار و گیر سے نکلنے کی کوشش کی ہوگی اور کسی قول کو محض اس لیے کہ وہ افلاطون یا ارسطو یا ابنِ سینا یا شیرازی کا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے اور جانچے پرکھے ماننے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس سلسلہ میں ہم شاہ صاحب کے ہاں یونانی فلسفہ کے بہت سے اثرات موجود پاتے ہیں۔ اس سے ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس عہد میں کسی بڑے سے بڑے محقق اور آزاد سے آزاد صاحبِ فکر کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا، کہ وہ اوپر کے مسائل پہ لکھے، اور اس زمانے کے مروجہ افکار و خیالات

سے بالکل بے اثر ہے۔ ایسا کبھی نہ ہوا ہے' اور نہ کسی انسان کے لیے جب تک کہ وہ انسان ہے، آئندہ ایسا ممکن ہے۔ اگر شاہ صاحب کے ہاں ایسی چیزیں ملتی ہیں تو ہمیں ان کو معذور سمجھنا چاہیے۔ زمان و مکان کی حدبندیوں کو جزوی طور پر بے شک توڑا جا سکتا ہے اور جینئیس ایسا کیا ہی کرتا ہے لیکن کلی طور پر زمان و مکان کا انکار یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس ضمن میں ایک بات ہمیں اور عرض کرنا ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انسانوں کے مادی ماحول کا ان کے افکار و خیالات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑتے کہ کیا واقعی ذہن انسانی کے تمام کے تمام واردات سرتاپا مادی ماحول ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ پہلے مادی ماحول بدلتا ہے' اور اس کی وجہ سے افکار و خیالات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ بہرحال اس سے تو آج انکار ممکن نہیں کہ انسانوں کے مادی ماحول اور ان کے افکار و خیالات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک حتمی طور پر دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ شاہ صاحب جس زمانے میں ہندوستان میں پیدا ہوئے، وہ شہنشاہیت اور جاگیرداری کا دور تھا اور اس عہد کی معیشت زرعی معیشت تھی۔ صنعتی اور مشینی دور جس کے انگریز پیغامبر بن کر ہندوستان پہنچے اس دور کی بھنک بھی شاہ صاحب تک نہ پہنچی تھی۔ ظاہر ہے ان حالات میں ممکن نہ تھا کہ شاہ صاحب کوئی ایسا معاشی اور اجتماعی نظام تجویز کر سکتے جو آج اس زمانے میں جب کہ صنعت اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے اور معیشت قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی بنتی جا رہی ہے۔ ہماری ضرورتوں کا کفیل ہو سکے۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ شاہ صاحب خود اپنی آنکھوں سے شہنشاہیت کو دم توڑتے دیکھ رہے تھے اور جاگیرداری بھی ان کے سامنے ختم ہو رہی تھی۔

اور وہ زرعی معیشت جس کے ماتحت ہر گاؤں اپنی ضرورتوں کا خود کفیل ہوتا تھا، تہ و بالا ہوتی نظر آتی تھی۔ ہندوستان کی معاشی زندگی کی اس پراگندگی کا اثر لامحالہ طور پر شاہ صاحب کے افکار پر پڑا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نظر نہیں آتے اور انہیں "فک کل نظام" یعنی ہر قائم شدہ نظام کو توڑ دینے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ اس سلسلہ میں کچھ تجویزیں بھی پیش فرماتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ ساری کوششیں اسی ماحول کی اصلاح کے متعلق تھیں۔ وہ اسی زرعی یا زیادہ سے زیادہ شہری معیشت کے نظام کو سدھارنا چاہتے تھے اور بس۔ مشین اور مشین سے پیدا ہونے والے حالات سے وہ واقف نہ تھے، اس لیے ان کی تحریروں سے اس قسم کی باتیں نکالنا مضحکہ خیز سا ہوگا، اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی جدت طرازیوں سے سادہ دل عقیدت مند خوش ہو جاتے ہیں، لیکن سمجھ دار لوگ ان چیزوں کو پڑھ کر ہنستے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اس قسم کی غیر علمی باتوں سے اہل علم احتراز کریں۔ اور خواہ مخواہ دوسروں کو اپنے اوپر نہ ہنسائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے اجتماعی فکر میں شاہ صاحب کا بہت بلند مرتبہ ہے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں تو ان کے پائے کا اب تک کوئی محقق اور عالم نہیں گزرا۔ ان کے افکار ہمارے لیے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں، اگر کبھی اللہ تعالیٰ نے ہندوستانی مسلمانوں کو توفیق دی اور انہوں نے اس امر کی ضرورت سمجھی کہ وہ اپنی قومی معیشت، ملی سیاست، جماعتی ترقی، مذہبی احیاء اور عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی فکری نظام بنائیں۔ جس سے کہ خود ان کی اپنی جمعیت مستحکم ہو۔ اور دوسروں کو بھی اس سے فیض پہنچے تو لازمی طور پر انہیں شاہ ولی اللہ صاحب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور ان کی حکمت کو ہی اساس

بناکر وہ اپنا شاندار مستقبل تعمیر کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں ہمیں شمس الرحمن صاحب محسنی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس مفید اور ضروری کام میں سبقت فرمائی۔ اور یہ کتاب لکھ کر عربی نہ جاننے والوں کے لیے شاہ صاحب کے خیالات سے استفادہ کرنا ممکن بنا دیا۔ امید ہے موصوف اس راہ میں اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور شاہ صاحب سے ہمیں برابر مستفید فرماتے رہیں گے۔

جامعہ نگر۔ دہلی

محمد مجیب (؟)
ستمبر ۱۹۴۶ء

عمرانی مسائل اور مابعد الطبیعات

شاہ صاحب معاشرہ، معاشرہ کے عناصر اور انسان کی اجتماعی زندگی پر گفتگو کرنے سے پہلے مابعد الطبیعیاتی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ذہن میں انسانیت اور اس کائنات کا کوئی واضح اور جامع تصور نہ ہو۔ اور نظامِ کائنات میں انسان کی حیثیت متعین نہ کی جائے اس وقت تک انسانی زندگی کے حقائق مشکل سے بے نقاب ہوتے ہیں' اس لیے اس سلسلے میں وہ پہلے اپنے مابعد الطبیعیاتی نظریات پیش کرتے ہیں اور پھر ان نظریوں کی بنیاد پر اپنے اجتماعی فلسفہ کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ لیکن ان مابعد الطبیعیاتی مسائل اور مذہبی نظریات کی آمیزش کے باوجود ان کی بحث کے کسی گوشہ میں غیر علمی انداز نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب کی کتابوں میں اجتماعیات سے متعلق جو مباحث بیان کئے گئے ہیں۔ وہ نئے علمی انکشافات سے متجاوز نہیں ہوتے اور انہوں نے جو نظریات پیش کیے ہیں، کم و بیش ان نظریوں ہی کو ماہرینِ عمرانیات کی تصانیف میں آج بھی حقائقِ مسلمہ کی حیثیت حاصل ہے۔

ممکن ہے بعض طبائع اوپر کا بیان ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ وہ شاید یہ کہیں کہ جو علمی تحقیقات، مذہبی تخیلات اور مابعد الطبیعاتی مسائل کا سہارا لیتی ہوں ان میں علمی شان کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ اس لئے شاہ صاحب کے یہاں علمی اندازِ تحقیق کا پایا جانا ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ اپنے ذہن میں یہ بات پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ مذہبی تصورات اور علمی اندازِ تحقیق کبھی ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس تاریخی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد علم و سائنس کے نئے انکشافات نے ماہرین سائنس اور عیسائیت کے علمبرداروں کے درمیان پیدا کر دی تھی۔ اس کش مکش کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا پنپنا ممکن نہیں۔ جب تک مذہب میں دم رہا، اس نے سائنس کے نام لیواؤں کو جور و ستم کا نشانہ بنائے رکھا۔ اب سائنس کی باری ہے۔ سائنس کی سرحد میں مذہبی تخیلات اور مابعد الطبیعاتی تصورات کی گنجائش نہ ہونی چاہیئے۔

مذہب اور تحقیقات علمی

مفصلہ بالا خیالات محض سطحیت پر مبنی ہیں۔ علمی تحقیقات کو مذہب سے خدائی بیر نہیں ہے کہ جہاں مذہبی تصورات نظر آئیں وہاں علمی اندازِ تحقیق قدم نہ رکھ سکے۔ علم و سائنس اور کائنات کے حقائق کے انکشافات کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنیت درکار ہے اور مابعد الطبیعاتی مسائل انسان کی اس ذہنیت پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان مسائل ہی سے ہر قوم کا نظریہ تشکیل پاتا ہے۔ اگر یہ نظریہ اس ذہنیت کو برداشت نہ کر سکے جس کا علم و سائنس تقاضا کرتا ہے تو ان میں ٹکراؤ

ہونا لازمی ہے۔ اگر اس میں سائنس کے نئے نئے انکشافات کے لئے پھلنے پھولنے کا پورا موقع حاصل رہے تو پھر مذہب اور سائنس میں کبھی تصادم نہیں ہوتا مطلب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ علم و سائنس کی دنیا کے لئے کس قسم کی ذہنیت کی ضرورت ہے اور اس ذہنیت کی نشوونما میں کس قسم کے مذہبی عقائد مدد دیتے ہیں اور وہ کون سے مابعد الطبیعاتی تصورات ہیں جو اس ذہنیت کے لئے زبردست رکاوٹ ہیں۔ ان سوالات کو ذرا تفصیل سے حل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ شاہ صاحب نے تحقیق کا جو طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی حقانیت واضح ہو جائے

علم کی پیاس انسان میں شاید اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانیت۔ البتہ جب تک انسان کی معلومات کا ذخیرہ محدود رہا وہ علم حاصل کرنے کا کوئی خاص طریقہ ایجاد نہ کر سکا۔ دنیا اور ماوراء دنیا کے متعلق اس کے اکثر خیالات محض اندازوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی تھے۔ لیکن اس کی معلومات میں جب اضافہ ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ نئی نئی باتیں سیکھتا جا رہا ہے۔ اس لیے معلومات کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ کو بنانا چاہیے۔ مشاہدہ نے انسان کو یہ بتایا کہ کائنات میں تنوع ہے اور مخلوقات کی ہر نوع ارتقاء کے ایک خاص سلسلہ سے گزرتی رہتی ہے۔ یہ ذہنیت اس بات کی محرک بنی کہ وہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ ان قوانین کا پتہ لگائے جن کا ہر ذرہ کائنات پابند ہے۔ یہ کام سائنس کے سپرد ہوا۔ تجربات کرنا، تجربوں سے اصول مستنبط کرنا، ان اصول کو تجربات کی روشنی میں آزمانا اور ضرورت پڑے تو ان اصول و قوانین میں ترمیم اور ردو بدل کرتے رہنا اس کا طریقہ عمل قرار پایا۔ اس طریقہ پر عمل کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ انسان میں وہ ذہنیت پیدا ہو چکی تھی جس کی رہنمائی کے بغیر تسخیر فطرت کی مہم شروع نہیں ہو سکتی۔ اب بھی جس دن اس ذہنیت میں مردگی کے

ہم پیدا ہو جائیں اسی دن سائنس کی دنیا کا تمام کاروبار ٹھپ ہو جائے۔

ابتدا میں انسان کو نہ فطرت پر اتنا قابو حاصل تھا اور نہ فطرت کے قوانین اور اصول اسے معلوم تھے۔ انسانوں کے پاس علم و تحقیق کی پیاس بجھانے کے لئے تجربات اور مشاہدات کا بہت قلیل ذخیرہ تھا انہیں اپنی اس خواہش کو تسکین دینے کے لئے زیادہ تر تخیل اور اندازے سے کام لینا پڑا مذہبی اور مابعدالطبیعاتی تصورات اس کے اندازوں میں جان ڈال دیتے تھے وہ ہمیشہ اپنی علمی کوتاہ نظری اور مشاہدات کی کوتاہ دامنی کو چھپانے کے لئے ان تصورات کی آڑ میں پناہ لیتے رہے۔ اور یہ تصورات کارخانۂ عالم کی ہر حقیقت کی تعبیر میں ان کی مدد کرتے رہے۔ قدرتِ ایزدی کی منشاء اور تقدیر کا منتر ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کے حل کے لئے کافی تھا۔ ان تصورات میں خدا کا تصور ایک مطلق العنان بادشاہ سے کم نہ تھا لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نے دنیا کو ہر حکمت اور مصلحت کی پابندی سے آزاد رہ کر پیدا کیا ہے اور آج بھی وہ اپنے فعل میں کسی ضابطہ اور قانون کا پابند نہیں ہے۔ وہ طاقت اور اختیار ہی کیا جو ہر وقت حکمت اور مصلحت کی زنجیروں میں گرفتار رہے اس قسم کی پابندی تو وہی کرتا ہے جو کسی کے آگے جواب دہ ہو۔ خدا سب سے بڑا حاکم ہے۔ اسے کیا پڑی ہے کہ اپنے کاموں کو حکم و مصالح سے وابستہ رکھے۔" وہ مطلق العنان بادشاہوں کو دیکھتے تھے۔ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں اور ان کے کاموں میں چون و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے تھے خدا کے کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ ہندوستان، مصر، بابل اور یونان کی تمام علم الاصنامی روایات اسی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ دیوتاؤں نے عشق بازی میں رنگ رلیاں منائیں اور ستارے پیدا ہو گئے کسی دیوتا نے شکار کھیلتے ہوئے تیر مارا، پہاڑ پیدا ہو گیا۔ ایک دیوتا نے اپنی جامِ

ے ترجمان القرآن۔ ابوالکلام آزاد۔

کھول دی۔ دنیا وجود میں آگیا۔ اصنام پرست اقوام کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات بھی اس بارے میں عقلی تصورات سے خالی تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ ایک مطلق العنان اور مستبد بادشاہ کی طرح خدا کے افعال بھی حکم و مصالح کی جگہ محض جوش و ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ غصہ میں آکر قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اور جوش محبت میں آکر کسی خاص قوم کو اپنی چہیتی قوم بنالیتا ہے۔ بلاشبہ عیسائی تصور کا مایۂ خمیر رحم و محبت ہے لیکن حکم و مصالح کے لئے اس میں بھی جگہ نہ تھی۔ کفارہ کے اعتقاد کے ساتھ حکم و مصالح کا اعتقاد نشوونما نہیں پا سکتا۔"

اس ذہنی فضا میں انسان اپنے ذوق جستجو کے لئے تسکین فراہم کر سکتا ہے اور نہ اس کے لئے حقائق کائنات بے نقاب ہو کر علوم و فنون کا دریائے بیکراں بن سکتے ہیں۔ اس ذہنیت کی اساس پر قیاس آرائی تخیل کی مدد سے جب معلومات کی ایک زبردست عمارت کھڑی ہو جائے تو اس وقت کائنات میں نظم و ترتیب اور اس کے نظام میں قانون اور اصول تلاش کرنے کی خواہش مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان ہر مشکل سے مشکل مسئلہ کا حل اور ہر پیچیدہ سے پیچیدہ حقیقت کا راز دریافت کرنے میں اپنی مفروضہ معلومات ہی سے مدد لیتا ہے اور ان سے حاصل شدہ نتائج کو اپنے عقائد کا جزو بنا لیتا ہے۔ اس کے لئے اپنے وجود کا انکار آسان ہے لیکن ان مفروضہ عقائد سے نجات حاصل کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس دامن تجربات سے خالی ہو جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں مشاہدہ کی سکت باقی نہیں رہتی

تخلیق بالحق کا نظریہ

قرآن اس ہمت شکن ذہنیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے، اس لئے خدا کی صفات اور افعال کے لئے عقلی تصور قائم کیا ہے اور یہ حقیقت واضح کی

ہے کہ حکمت اور مصلحت کی پابندی قدرت کے منافی نہیں ہے۔ یہ پابندی طاقت اور اختیار کے کمال کی دلیل ہے۔ بلاشبہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی حکمت و عدالت کا مقتضی یہی ہے کہ جو کچھ کرے اس میں حکمت و مصلحت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے شرائع اور احکام کے مصالح پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ شریعت کے احکام کو حکمتوں اور مصلحتوں سے قطعاً خالی تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں خدا نے اعمال اور ان کی جزا و سزا میں کوئی مناسبت نہیں رکھی۔ ان کے نزدیک اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ خدا کو وہ ایک ایسے آقا کی مانند سمجھتے ہیں جو اپنے غلام کو محض بے کار و عبث کاموں کا حکم دیتا ہے۔ کبھی اسے پتھر اٹھانے کا حکم دے اور کبھی یہ کہے کہ وہ جو سامنے درخت نظر آ رہا ہے۔ اس تک جاؤ اور اسے ہاتھ لگا کر واپس چلے آؤ۔ ان سب احکام کے ذریعہ وہ اپنے غلام کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ غلام اگر فرماں برداری کا اظہار کرے تو اسے انعام و اکرام ملتا ہے اور اس کی نافرمانی سخت سے سخت سزاؤں کا باعث بنتی ہے۔ ان کی نظر میں خدا کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ بھی شرائع کے ذریعہ بندگی کا امتحان لینا چاہتا ہے اسے یہ دیکھنا ہے کہ اس کے بندوں میں سے کون اطاعت شعار نکلتا ہے اور کون نافرمان۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں، اس قسم کا عقیدہ رکھنا جائز نہیں سنتِ رسولؐ اور اجماعِ امت دونوں کی روشنی میں اس قسم کے عقیدے فساد ذہنیت کی دلیل ہیں۔

فطرت نے اس کائنات کو بے ہنگم طریقہ سے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کی پیدائش میں حکمت کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر شے میں خاص نظم و ترتیب پائی جاتی ہے۔ قرآن نے تخلیق کائنات کے اس نظریہ کو جابجا تخلیق بالحق

سے تعبیر کیا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت دنیا کی ہر شے کو اصول و قوانین کا پابند ماننا پڑتا ہے۔ جن کی تلاش میں سر کھپانا انسانی زندگی کا سرمایہ ہے مسلمانوں کی ذہنیت میں قرآن نے یہی انقلاب پیدا کر دیا تھا جس نے ان پر علوم و فنون کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن بعد ان کی یہ ذہنیت توہمات اور باطل اندازوں کا شکار بن گئی نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو ان کی ترقی کی رفتار سست ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ علوم و فنون کے تمام خزانے ان کے ہاتھوں سے نکل کر غیروں کے پہنچ گئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے زندگی کے متعلق اس کے اس جامع تصور کے ذریعہ مسلمانوں کی اس خفیہ ذہنیت ہی کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ تقدیر اور منشا ایزدی کے غلط تصور کی وجہ سے حکمت اور علم کائنات کی طرف سے ان میں جو کنارا کشی پیدا ہو گئی تھی، شاہ صاحب کے نزدیک وہ مذہب کی روح کے سراسر خلاف ہے وہ فرماتے ہیں۔

دنیا کا نظام بعض قوانین اور اصول کا پابند ہے۔ کسی زندہ کی مجال نہیں کہ وہ ان کی خلاف ورزی کر سکے۔ خود قدرت الٰہی بھی ان کے خلاف کوئی کام نہیں کرتی اس لئے کائنات کو ایک خاص نظام کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس نظریہ کو محض عقلی اور قیاسی دلائل سے ثابت نہیں کرتے۔ اس منزل میں بھی وہ انسانی مشاہدات اور تجربات کو اپنا خضر راہ مانتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا ہر قدم ان مشاہدوں اور تجربوں کی رہنمائی ہی میں آگے بڑھتا ہے۔

شاہ صاحب نظام کائنات کو سمجھنے کے لئے قدرت الٰہی کی چار صفات کی وضاحت فرماتے ہیں۔

ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی۔ اس کی اس بحث کو علم کمالاتِ اربعہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالحق دہلوی حقانی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب اس علم کے

خود ہی موجد ہیں۔ ان سے پہلے اس کو کسی نے مدون نے کیا تھا۔ یہ صفتیں حیاتِ کائنات کی چار حالتوں کا بیان ہیں۔ عدم محض سے وجود میں لانے کو ابداع کہتے ہیں۔ جب کائنات پیدا ہو گئی تو اسے بے شمار مخلوقات کی شکل دی گئی اور ان سب میں خاص حکمتوں اور مصلحتوں کا خیال رکھا گیا۔ اس فعل کو شاہ صاحب نے خلق کی صفت سے تعبیر کیا ہے۔ دنیا کا کاروبار ایک نظام کے ساتھ چل رہا ہے، جس میں ہر جگہ تدبیر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اصول اور قوانین کے ذریعہ کائنات کے تمام حادثات اور واقعات باہم ربط و تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا نام تدبیر ہے اور تدلی عبارت ہے اس فیض سے جو ذاتِ حق برابر اس کائنات کے نظم و انصرام کے سلسلہ میں فرماتی رہتی ہے۔ ابداع اور تدلی چونکہ محض نظری اور مابعد الطبیعاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے یہاں بحث نہیں کریں گے۔ البتہ تدبیر اور خلق کے مفہوم کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان دونوں کے صحیح مفہوم کو اپنے فلسفۂ اجتماع کا اساس بنایا ہے۔ خلق اور تدبیر کی کارفرمائیوں کے مظاہر شاہ صاحب مشاہدہ اور انسانی تجربات کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں۔ دنیا کے حادثات و واقعات کا اصول و قوانین کے ذریعہ باہم ربط و تعلق، بے شمار مخلوقات کا وجود اور ان میں سے ہر ایک کا حکمت و مصالح سے خالی نہ ہونا ایسے حقائق ہیں جن تک انسان مشاہدہ اور تجربات ہی کے ذریعہ پہنچتا ہے۔

تدبیر اور سلسلۂ اسباب و علل

قدرت ایزدی نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں۔ انہیں اپنی زندگی گزارنے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ایک دوسرے کا پابند بنایا ہے۔ وہ ایک

دوسرے سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ کسی ایک واقعہ کا پیش آنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ نظامِ کائنات کے لئے ناگزیر ہے۔ حکمت الٰہی اس نظام قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی حکمت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے کائنات کی ہر شے میں فعل وانفعال کی صلاحیت رکھی ہے۔ کائنات کے مختلف عناصر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس فعل وانفعال کا نتیجہ بعض مخصوص حوادث کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس حوادث پر اس نظام کی عمارت کھڑی ہو جاتی ہے جسے قدرتِ خداوندی محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ ان مسائل کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے:۔

> "دنیا میں سودمند اشیاء کی موجودگی کے ساتھ ان کی بخشش اور تقسیم کا ایک نظام بھی موجود ہے۔ اور فطرت صرف بخشتی ہی نہیں بلکہ جو کچھ بخشتی ہے۔ ایک مقررہ انتظام اور منضبط ترتیب ومناسبت کے ساتھ بخشتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں ہر وجود کو زندگی اور بقا کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس طرح جس جس وقت اور جیسی جیسی مقدار میں ضرورت تھی، ٹھیک اسی طرح ان ہی وقتوں اور اسی مقدار میں اسے مل رہی ہے اور اسی نظم وانضباط سے یہ کارخانۂ حیات چل رہا ہے۔"

"زندگی کے لئے پانی اور رطوبت کی ضرورت تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے ہر طرف موجود ہیں۔ لیکن اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو یہ زندگی کے لئے کافی نہ تھا۔ زندگی کے لئے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ پانی موجود ہو بلکہ ضروری ہے کہ ایک خاص طرح کے انتظام، ایک خاص طرح کی ترتیب اور ایک مقررہ مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ پس یہ جو دنیا میں پانی بننے اور تقسیم ہونے کا ایک خاص طرح

کا انتظام پایا جاتا ہے اور فطرت صرف پانی بناتی ہی نہیں بلکہ ایک خاص ترتیب و مناسبت کے ساتھ بناتی ہے اور ایک خاص انداز کے ساتھ بانٹتی ہے تو یہی ربوبیت ہے اور اسی ربوبیت کے تمام اعمال کا تصور کرنا چاہیئے۔ قرآن کہتا ہے یہ اللہ کی رحمت ہے۔ جس نے پانی جیسا جوہر حیات پیدا کر دیا۔ لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے ایک ایک گوشہ تک پہنچاتی ہے ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی۔ ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور پھر زمین کے ایک ایک تشنہ ذرہ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سیراب کر دیتی ہے۔"

اس تدبیر و ربوبیت کے نظام کو چلانے کے لئے فطرت نے کائنات میں کچھ قوتیں ودیعت کی ہیں۔ اشیائے کائنات میں فعل و انفعال اور عمل و ردِ عمل کی صلاحیت یہی قوتیں پیدا کرتی ہیں۔ ان کی بدولت ہی ہستی کی تگ و دو کا سلسلہ جاری ہے۔ خدائی فیصلے بھی ان قوتوں کے اثرات اور نتائج ہی کا دوسرا نام ہے شاہ ولی اللہ صاحب کائنات کی اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے کہ پہلے چند اصول فرض کر لیں اور پھر ان کی روشنی میں نظری طور پر نتائج نکالتے چلے جائیں۔ وہ قرآن کے استقرائی طریقہ استدلال کی روح سے پوری طرح متاثر ہیں اور عناصر کی قوتوں کا حال دریافت کرتے وقت انسانی مشاہدات اور تجربات کو مشعل راہ بناتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسانیت حقائق کائنات دریافت کر لے والے تین گروہوں پر مشتمل ہے۔ طبیعات کے ماہرین منکرین اور علماء الٰہیات۔ ان کے نزدیک یہ سب گروہ اس بات کو مانتے ہیں کہ دنیا کے بعض حادثات اپنے پیشرو حادثوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ عقلاء اور حکماء اپنے نظام عقلی اور علماء الٰہیات اپنے

الیاتی مسائل کی اس ہی اصول کے ذریعہ وضاحت کرتے ہیں۔ طبیعات کے ماہرین بھی اس بات کے قائل ہیں۔ زندگی کے روزمرہ مشاہدات اور تجربات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اگر ہم ان اصول کو نہ مانیں تو ہمیں ان تمام علوم و فنون کا انکار کرنا پڑے گا۔ جنہیں انسانیت نے ہزارہا برس کی مسلسل محنت و کوشش کے بعد سیکھا ہے۔ اگر کوئی انسانیت کی گزشتہ تاریخ کا انکار کرنے کے لئے تیار نہیں اور وہ انسانیت کے دریافت کئے ہوئے تمام علوم کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ اس دنیا میں اسباب و علل کا سلسلہ تسلیم کرے اور یہ مانے کہ کائنات کی قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ ہی قدرت الٰہی اپنے نظام تدبیر و ربوبیت کو چلا رہی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے "تفہیمات الٰہیہ" میں ایک جگہ اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اس اصول کو علومِ طبعی کی معلومات کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ طبیعات کے ماہرین اگر حقیقت کو تسلیم نہ کریں تو انہیں اپنے تمام جذبات کا انکار کرنا پڑے گا۔ انسان نے طب کے سلسلہ میں جس قدر تحقیقات کی ہیں وہ اسی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے بدن میں صفرا کی زیادتی ہو جاتی ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ اور یہ زردی رفتہ رفتہ سیاہی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ تو صفرا کی زیادتی کے ظاہری اسباب ہیں۔ صفرا کی زیادتی کا اخلاق اور عادات پر بھی اثر پڑتا ہے صفرا کا مریض چڑچڑا ہو جاتا ہے اسے جلد جلد غصہ آتا ہے اور اس کی طبیعت ہر وقت سست اور پریشان رہتی ہے۔ وہ بات بات پر لڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے، اور اس کے بولنے کی رفتار

تیز ہو جاتی ہے۔ اس علم کے ماہرین نے مختلف قسم کے مزاج رکھنے والوں کی خصوصیات کا کھوج لگایا ہے۔ اور تفصیل سے بتایا کہ انسان کے اخلاط میں سے کسی خلط میں اگر فساد پیدا ہو جائے تو اس کے ظاہری اور معنوی اثرات کیا ہوتے ہیں۔

انسانیت کے صدہا سالہ تجربہ سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ لوگوں کی نفسی کیفیات، ان کے اخلاق و عادات اور اوصاف و خصائل میں کیوں فرق ہوتا ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا ہے کہ خاص قسم کے خواب کیوں نظر آتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی، زراعت کے ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ مختلف قسم کی زمین کا کھیتی پر کیا اثر پڑتا ہے کسی خاص قسم کے زمین کے پودے اور درخت اور درختوں کے پھلوں اور پھولوں میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے جانوروں کی نسل کشی میں تجربہ حاصل کیا ہے وہ مختلف تدابیر کے ذریعہ اکثر اپنی خواہش کے مطابق ان سے نسل حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہ تمام تجربات گواہی دیتے ہیں کہ اس کائنات میں اسباب و علل کا سلسلہ قائم ہے۔ اس کائنات کی قوتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

یہ قوتیں بے شمار ہیں۔ انہیں دریافت کرنے کی کوشش ہی کے دوران مختلف علوم وجود میں آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتابوں میں جن قوتوں کا ذکر کیا ہے۔ انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عناصر کے طبعی خواص، اشیاء کے نوعی تقاضے اور مابعد الطبیعاتی قوتیں۔ یہ سب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کے اسی فعل و انفعال کی بنا پر دنیا میں نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں اور جاندار اشیاء کے ارادے اور افعال خاص شکل میں

رونما ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض دفعہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہہ سے انسانی ذہن قاصر رہتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ واقعات کن اسباب کی بناء پر پیش آتے ہیں۔ وہ پچھلے واقعات، عناصر کے خواص اور نوعی تقاضوں کو دیکھتا ہے تو ان میں پیش آنے والے واقعات کے وجود کیلئے اسے کوئی وجہ جواز نہیں ملتی۔ اگر کسی حقیقت تک انسانی ذہن نہ پہنچے تو اس سے انکار کر دینا دانش مندی سے بعید ہے اس کے برخلاف ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بعض اوقات اسباب کا صحیح علم کیوں نہیں ہوتا ؟

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کبھی تو یہ قوانین ہم آہنگ ہو کر ایک قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں اور کبھی ان میں کش مکش پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض قوتیں ایک قسم کے حادثات پیدا کرنا چاہتی ہیں اور دوسری ان کے خلاف بعض دوسرے اثرات کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس کش مکش میں کبھی ایک فریق کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کا۔ لیکن ان دونوں کا وزن برابر ہو اور ان میں نہ کسی ایک کی بڑھی ہوئی طاقت اس کش مکش کا خاتمہ نہ کر سکے تو اس وقت بقائے انفع کے اصول پر فیصلہ ہوتا ہے۔ جس قوت کے اثرات خیر مطلق کے حامل ہوتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ عناصر کی قوتوں کے نتائج اگر قباحت کا پیش خیمہ بن رہے ہوں تو قدرت الٰہی بقائے انفع کے اصول ہی کے ذریعہ فیصلہ بدل دیتی ہے۔

"کائنات ہستی کا بناؤ حسن اور ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا تھا اگر اس میں خوبی کے بقا اور خرابی کے ازالہ کے لئے ایک اٹل قوت سرگرم نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہے ؟ فطرت کا انتخاب ہے۔ فطرت ہمیشہ

---

[1] ترجمان القرآن ابو الکلام آزاد۔

چھانٹتی رہتی ہے۔ وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور بہتری باقی رکھتی ہے۔ فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم اسے بقاء اصلح کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اصلح یعنی لیکن قرآن بقائے اصلح کی جگہ بقاء انفع کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اس کارگاہ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے۔ جس میں نفع ہو کیونکہ یہاں رحمت کارفرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادہ و فیضان ہو وہ نقصان و برہمی کو گوارا نہیں کر سکتی۔ تم سونا کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتے ہو۔ کھوٹ جل جاتا ہے۔ خالص سونا باقی رہ جاتا ہے یہی مثال فطرت کے انتخاب کی ہے۔ کھوٹ میں نفع نہ تھا نابود کر دیا گیا۔ سونے میں نفع تھا۔ باقی رہ گیا۔"

اسباب و علل کا یہ تمام سلسلہ انسان کی نظر سے اکثر او جھل رہتا ہے۔ مختلف قوتوں کے اثرات کا باہم ٹکراؤ معاملہ کو پیچیدہ بنا دیتا ہے اور انسان کی نظر حقیقت کی تہہ تک پہنچنے نہیں پاتی۔ اس کی محدود صلاحیت کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ہر دفعہ واقعہ کے تمام اسباب، اثر انداز ہونے والی تمام قوتوں اور ان کے اثرات کے باہمی توازن کا ایک وقت میں پوری صحت اور قطعیت کے ساتھ احاطہ کر سکے۔ ہمارے بعض تجربات یہ بتاتے ہیں کہ ایک خاص قسم کے واقعات کے نتائج ایک متعین شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا نہیں ہوتا تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں کسی ایک فریق کی قوت و طاقت اور اس کے ظاہری اسباب و وسائل کی بنا پر اس کی کامیابی اور کامرانی یقینی نظر آتی تھی لیکن بعد کے

واقعات اس امید کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ جن قوتوں کی بنا پر ہم شکست خوردہ فریق کی کامیابی کے متوقع تھے۔ ایسا معلوم ہے کہ ان کی تاثیر کم کر دی جاتی ہے قوتوں کی یہ تاثیر کیوں کم ہو جاتی ہے ؟ ہمارے زمانہ کی نفسی تحقیقات اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔ بعض ایسی نفسیاتی کیفیات اور دوسری وجوہات ان قوتوں کی تاثیر کو کمزور کر دیتی ہیں جن پر عام طور سے ہماری نظر نہیں جاتی۔ کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد جب ہم اس کے تاریخی پس منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے خیال میں اس واقعہ کو پیدا کرنے والی قوتیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ اس کمزوری کے پیشِ نظر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ کو پیش نہ آنا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس واقعہ کا پیش آنا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی غیبی طاقت نے تاریخی قوتوں کی تاثیر کو زیادہ کر دیا ہے۔ قوتوں کی تاثیر میں یہ کمی اور زیادتی یا تبدیلی انسان کی الہامی قوت کا نتیجہ نظر آتی ہیں۔ انسان اپنی اس مابعد الطبیعاتی قوت کے ذریعہ قباحت اور فساد کو مٹانے کے لیئے دوسری مخالف قوتوں پر غلبہ پا لیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ یہ سب اس لیئے ہوتا ہے کہ قدرت ایزدی بقاء انفع کے اصول پر عامل ہے۔ وہ ہمیشہ فساد اور نقص کو محو کر دیتی ہے۔ اور اس ترقی پذیر دنیا میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو۔

خلقِ کائنات اور فطری تقاضے

تدبیر کی اس کارفرمائی کا گہری نظر سے مطالعہ کیجیئے تو کائنات کی تمام حقیقتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت کہ فطرت کی طرف سے ہر چیز کو ایک جدا خاصیت اور ایک خاص استعداد عطا ہوئی ہے اور دنیا کی تمام اشیاء اپنی ان خاصیتوں

اور استعدادوں ہی کے ذریعہ دنیا کے نظام کو چلا رہی ہیں، ہمیں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس حقیقت کے وا شگاف ہونے کے بعد یہ بات یقینی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب کوئی شے کسی خارجی شکل میں پائی جائے گی تو اس میں خاص قسم کی خاصیتیں ہوں گی۔ جب ہم موجودات عالم میں سے ہر ایک کی ان مختلف خصوصیات اور استعدادوں کی چھان بین کرتے ہیں تو ہمیں مظاہر قدرت میں اختلافات اور امتیازات کے دوش بدوش کچھ باتیں مشترک بھی نظر آتی ہیں۔ وجود یعنی وہ حقیقت جس کی بناء پر ہم کسی شے کو موجود دیکھتے ہیں۔ ان سب میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے، یہ اگر نہ، تو کوئی شے موجود نہیں ہو سکتی۔ مخلوقات کی بے شمار قسمیں اسی وجود سے نکلی ہیں اس منزل میں مخلوقات نہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور نہ ان میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک کو دوسرے سے امتیاز دے سکیں البتہ اس منزل سے گزر کر ان پر تعینات کی بندشیں عائد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہر نئی منزل کچھ نئے امتیازات اور تعینات لے کر آتی ہے۔ پہلی منزلوں کے نشانات ان نئے تعینات کی وجہ سے مٹنے نہیں پاتے۔ بلکہ ان میں مزید اضافہ کا باعث بنتے ہیں مثلاً جمادات کو دیکھئے۔ ان کی تمام قسموں میں جمادیت کی خصوصیتیں مشترک ہوتی ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک قسم کا دوسرے سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں تنوع اور امتیازات کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہی نباتات کا حال ہے۔

انسان اور دوسری جاندار اشیاء میں حیوانیت مشترک ہے۔ لیکن انسانی خصائص انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ انسانوں میں بھی اگرچہ انسانیت سب میں پائی جاتی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی انفرادی خصوصیات اور خاص تعینات کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کا مالک ہے۔

یہ سلسلہ کائنات کی تمام اشیاء میں جاری وساری ہے۔ ان حقائق پر سے پردہ ہٹ جاتے تو انسان کی وجدانی نظر اس ذات تک پہنچ جاتی ہے جو تمام موجودات کا مبدا و سرچشمہ ہے۔ اس کے احاطہ سے وہ سلسلہ بھی مخفی نہیں رہتا جس سے ہوکر دنیا نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

جس محقق پر خلق اور تدبیر کائنات کے یہ سربستہ راز منکشف ہو جائیں، وہ اپنی ہر تحقیق شروع کرنے سے پہلے متعلقہ اشیاء کی وہ خصوصیات اور استعدادیں معلوم کرتا ہے جو اپنے گردوپیش سے انہیں ممتاز کرتی ہیں اور پھر ان فطری قوانین کا پتہ لگاتا ہے جن کی یہ اشیاء پابند ہوتی ہیں۔ جن چیزوں کی استعدادیں اور خاصیتیں ایک قسم کی ہوتی ہیں، ان میں ایک قسم کے قوانین ایک ہی کام کرتے ہیں۔ لیکن ان میں جہاں مزید تعینات کا اضافہ ہوتا ہے، اس جگہ سے دوسرے قوانین کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً انسان اور گھوڑے میں حیوانیت مشترک ہے۔ ان میں حیوانیت کی حد تک بہت سی مشترک خصوصیات پائی جاتی ہیں حیوانیت کی نشوونما کے لیے ان میں ایک ہی قسم کے قانون اور قاعدے کارفرما نظر آتے ہیں۔ انسانیت اور گھوڑا ہونے کی خصوصیات ان میں مختلف ہیں۔ اس لئے انسانیت کی جن قوانین کے ماتحت نشوونما ہوتی ہے وہ گھوڑے پر عائد نہیں کیے جا سکتے اور گھوڑا ہونے کی صلاحیت کو جن باتوں کی ضرورت ہے وہ انسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس طرح ہر نوع کی استعداد اور صلاحیت خاص قسم کے اثرات چاہتی ہے اور یہ سب فطری قوانین کی پابند ہیں۔ کسی نوع کی استعداد اور خاصیت جو اثرات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اس کو اشیاء کے نوعی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کائنات کی ہر شے میں پائے جاتے ہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی سمجھنے کے لئے شاہ

صاحب اس کے ذہنی تقاضوں کی دریافت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ذہنی تقاضے ان کے فلسفۂ اجتماع کی جان ہیں۔ ان کے ذریعہ ہی ان کے مابعدالطبیعیاتی نظام اور عمرانی نظریات میں رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی کی چھان بین کے لیے انسان کی فطرت اور اس کے ذہنی تقاضوں کو آج بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

عمرانی مسائل اور شاہ صاحب کا طریقۂ تحقیق

شاہ ولی اللہ صاحب کے مابعد الطبیعیاتی رجحان کے ساتھ سائنسدان میں تجربہ اور مشاہدہ کی جو صلاحیت پائی جاتی ہے، اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ عمرانی مسائل کی تحقیقات میں انہوں نے جو طریقہ استعمال کیا ہے وہ اسی ذہن سے پوری طرح متاثر ہے۔ وہ انسان کے اجتماعی اداروں کو سمجھنے اور ان کی پسندیدہ صورتیں معلوم کرنے کے لیے استقراء کا راستہ اختیار کرتے ہیں! انسان اجتماعی ادارے کیوں بناتا ہے؟ تاریخ میں کب کب یہ ادارے بنتے رہے ہیں، اور انہوں نے کون کون سی شکلیں اختیار کی ہیں؟ پہلے شاہ صاحب انسانیت کے تجربات کے قدیم ذخیرہ اور موجودہ مشاہدات کی روشنی میں یہ سب باتیں معلوم کرتے ہیں اور اس کے بعد موجودہ اجتماعی اداروں کا تجزیہ اور ان کی خرابیوں کے دُور کرنے کا طریقہ دریافت کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک انسان کے نوعی تقاضے (فطرتِ انسانی) اس کی اجتماعی زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ وہ ہر اس شخص کے لیے جو انسان کی اجتماعی یا انفرادی زندگی کے حقائق کو بے پردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ ضروری سمجھتے ہیں

کر وہ پہلے انسان کے ان زرعی تقاضوں کی تلاش کرے۔ اور اس کی فطرت کے سربستہ رازوں کو دریافت کرے۔ فطرتِ انسانی کا علم حاصل کیے بغیر اجتماعی اداروں کو سمجھنے کی کوشش کرنا شاہ صاحب کے نزدیک بے کار ہے! افلاطون سے لے کر ہیگل تک اجتماعیات کے تمام مفکرین یہی طریقہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسانی فطرت کے بارے میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتا تھا اور یہی نقطۂ نظر اس کے اجتماعی فکر کے لیے بنیاد کا کام دیتا ہے۔ ہیگل کے بعد اجتماعی مفکرین نے اپنے پیشروؤں کے برعکس انسانی فطرت کے اس تصور کو نظر انداز کر دیا اور علوم اجتماعی میں انسانی فطرت سے علیحدہ رہ کر اجتماعی اداروں کا تجزیہ کیے جانے لگا۔ یہ طریقہ زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ انسان کی نفسی زندگی میں ارتقاء کا اصول ماننے کے بعد نفسیات ترقی پانے لگی اور اس کی تحقیقات نے انسان کی فطرت کو بے نقاب کرنے کی ٹھان لی۔ عمرانیات میں آج کل انسانی فطرت کے ان حقائق سے کافی فائدہ حاصل کیا جا رہا ہے۔ اس طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے اجتماعی تحقیقات کے لیے جس بات کی بنیاد قرار دیا تھا، اُسے آج پھر حقیقتِ مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

عمرانیات کا نفسیات اور اخلاقیات سے تعلق

انسان کی فطرت اور اس کے زرعی تقاضے دریافت کرنے کے لیے شاہ صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ بہت آسان ہے۔ اس سے جو نتائج نکلتے ہیں، ان کی تغلیط میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ جس شئے کے زرعی تقاضے معلوم کرنا چاہتے ہیں، اس کا دوسری اشیاء سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ان سب کی مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز باتوں کا پتہ لگاتے ہیں۔ ظاہری اختلاف کے پردے

میں ان کی استعدادوں اور خاصیتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ اسے ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ انسان کے نوعی تقاضے بھی شاہ صاحب اسی طریقہ پر معلوم کرتے ہیں اور نوعی تقاضے ہی دراصل شاہ صاحب کے نزدیک بنیاد ہیں انسانی نفسیات اور اس کے اجتماعی مظاہر کے۔ اس لیے عمرانی مسائل کا ان کے یہاں نفسیات اور اخلاقیات سے بہت گہرا تعلق ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتابوں میں انسان کی نفسیات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے متعلق کبھی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی جب تک کہ ہم مختلف انسانوں کی ان نفسی کیفیات کا اندازہ نہ لگائیں جو ان میں مل جل کر رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ شاہ صاحب جماعتی نفسیات کو نفسیات افراد کے تحت حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ایسی تفریق نہیں ملتی جس کی بنیاد پر زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جاسکے۔ چنانچہ اسی بنا پر ان کی کتابوں میں نفسیات کے انفرادی اور اجتماعی تمام مباحث ملے جلے نظر آتے ہیں۔ اور ان ہی نفسیاتی مسائل پر ان کے عمرانی نظریات مبنی ہیں۔

شاہ صاحب کے یہاں انسان کی نفسیات اور اخلاقیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے، مگر ان کی اخلاقیات مفروضہ اصولوں پر مبنی نہیں ہے۔ وہ خود انسان کے نوعی تقاضوں ہی سے نکلتی ہے۔ ہر انسان میں مختلف نوعی اور فردی تقاضے پوشیدہ ہیں، وہ انہیں پورا کرنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیئے کہ سب پورے ہوتے رہیں۔ اگر ایک تقاضے کو پورا کرنے پر زیادہ زور دیا جائے گا تو دوسرے تقاضے پورے نہ ہوسکیں گے۔ عدالت اور اعتدال کے ذریعہ ان تقاضوں کی تکمیل مستحسن ہے بس نقطۂ کمال

تک پہنچنا انسانی زندگی کی معراج ہے اور انسان کیلئے اس میں سعادت مضمر ہے۔ اس معیاری زندگی کو سامنے رکھ کر شاہ صاحب ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کے مسائل کو سمجھنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے انسانوں کی مختلف قسمیں اسی معیار کو سامنے رکھ کر کی ہیں۔ اجتماعی زندگی کے مختلف دور بیان کرتے وقت بھی ان کے پیش نظر یہی بات رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار و تعلیمات کا یہ کمال ہے کہ ان کے اخلاقی نظریات، ان کے اجتماعی نظام، نظام کائنات اور مادی فلسفہ سے علیحدہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان سب میں ایک باہمی ربط ہے اور یہ سب کچھ ان کی مابعد الطبیعیاتی، تجرباتی اور استقرائی ذہنیت میں مکمل ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔

شاہ صاحب اور ارتقاء

زندگی کے ان گوناگوں مسائل میں تحقیقات کا یہ طریقہ شاہ صاحب ہرگز استعمال نہ کر سکتے اگر وہ کائنات میں ارتقاء کے قائل نہ ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈارون کے نظریات نے اصول ارتقاء کو جو درجہ عطا کیا ہے، وہ اس سے پہلے حاصل نہ تھا اور نہ اس کو ڈارون سے پہلے کسی نے اتنی منظم اور یقینی شکل میں پیش کیا تھا لیکن اس کے ماننے والے پہلے بھی پائے جاتے تھے۔ اور اس اصول کو ماننے سے ان میں علم و تحقیق کا وہی ذہن پیدا ہوا تھا جو آج ڈارون کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ وہ بھی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمجھنے کے لیے تاریخی واقعات کا سلسلہ سامنے رکھتے تھے۔ اور ماضی کے آئینہ میں زندگی کے ارتقائی منازل کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

شاہ صاحب میں یہ ذہن وحدت الوجود کی بدولت پیدا ہوا تھا۔ وحدۃ الوجود تنزلات کے ذریعہ تخلیق کائنات میں ارتقاء کا اصول تسلیم کرتا ہے۔ یہ اصول

اس عقیدہ کے ساتھ مل کر کہ دنیا میں اسباب وعلل کا سلسلہ قائم ہے، نہایت ترقی یافتہ تحقیقات کی بنیاد بن سکتی ہے۔ آج دنیا میں جو رہا ہے وہ پچھلے حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ حالات انسان کے نوعی تقاضوں کی تکمیل کی داستان تھے۔ آج بھی وہ نوعی تقاضے موجود ہیں، لیکن بدلے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر وہ نئے حالات پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ افراد کی جبلت اور ان کے نوعی تقاضے حالات بدل جانے کی وجہ سے ہمیشہ اپنی تکمیل کے لیے نئی نئی صورتیں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ارتقاء کا یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اسی سے ہی تاریخ بنتی ہے۔ جو شخص آج کی حالت سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ سلسلہ ضرور رہنا چاہیئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی بحث ارتفاقات (اجتماعی اداروں کی بحث) کو قرآنی حکمت کی تشریح کا درجہ دیتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

"یہ حکمت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود دنیا۔ دنیا کی ارتفاقی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس حکمت نے کیسے کیسے ترقی کے مراحل طے کیے۔ شاہ صاحب نے اپنی کتاب "تاویل الاحادیث" میں اس پر بحث کی ہے۔ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں زندگی کے کیا کیا ضابطے اور شرائع تھے۔ اور ان سے کس طرح اس عہد کی حاجتیں پوری ہوتی تھیں۔ پھر جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی گئی۔ افکار و خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ فلسفہ ولی اللہی ان مباحث سے بحث کرتا ہے اور ان سب کو حل کرتا ہے۔ شاہ صاحب حضرت ابراہیمؑ سے پہلے جو دور تھا اسے صابئین کا دور قرار دیتے ہیں۔ اس دور میں آدمؑ، ادریسؑ اور نوحؑ علیہم السلام ہوئے۔ شاہ صاحب نے

تاویل الاحادیث میں اس دور کی پوری تشریح کی ہے۔ ان کے نزدیک
ادریس علیہم السلام طبیعیات، ریاضیات اور الٰہیات کے بانی تھے۔
غرضیکہ یہ حکمت اتنی ہی عالمگیر ہے جتنی کہ خود انسانیت ہے۔ اس کا مرکز
کبھی ہند ہوا۔ کبھی ایران، اور کبھی یونان۔ پھر حضرت ابراہیم آتے ہیں۔
یہاں سے حنیفی دور شروع ہوتا ہے، حنفاء یعنی ملت ابراہیمی کے
پیرو اسی صابی فلسفے کو دوسرے رنگ میں بدل دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی
کیسے ہوئی۔ اس کے اسباب کیا تھے اور کس شکل میں ہوئی۔ شاہ
صاحب نے اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ انسانی فکر کی
ارتقائی تاریخ کا اس طرح تجزیہ کرنے سے خود انسانیت کی حقیقت
اور ماہیت واضح ہو جاتی ہے اور ہم جان سکتے ہیں کہ انسان کیا ہے
اور انسانیت کا مقصود کیا ہے۔ مختصراً شاہ صاحب کی حکمت عملی کا
خلاصہ یہ ہے کہ انسانی فکر روزِ اول سے ہی مسلسل چلا آتا ہے۔
دورِ صابئین میں یہی فکر تھا۔ پھر حنیفی دور میں اس نے دوسری صورت
اختیار کی :

مولانا سندھی کی مذکورہ بالا تشریح سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو
جاتی ہے کہ شاہ صاحب کے نظریات کسی جگہ بھی اصول ارتقاء اور حقائق تاریخی
سے کنارا کشی نہیں کرتے۔ ان کے عمرانی مباحث ان دونوں چیزوں سے پوری
طرح متاثر ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے یہاں تین قسم کے مباحث ملتے ہیں ا۔

ا۔ زرعی تقاضے انسان کو کم سے کم کس قسم کے حالات پیدا کرنے پر مجبور
کرتے ہیں۔ وہ کسی جگہ ہو۔ یہ حالات پیدا کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ
مباحث شاہ ولی اللہ صاحب تاریخ اور نفسیات کی مدد سے حل کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے درجہ میں شاہ صاحب یہ بتاتے ہیں کہ ان ناگزیر حالاتِ اجتماع سے آگے بڑھ کر اجتماعی زندگی کن سے ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور کس طرح۔ اس سلسلہ میں وہ تاریخی پس منظر کو سامنے رکھ کر سوسائٹی کے ارتقاء سے بحث کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری بحث سوسائٹی کے کمال اور اس کی بیماری اور صحت سے متعلق ہے اور شاہ صاحب تاریخ کی روشنی میں یہ بتاتے ہیں کہ سوسائٹی میں فساد کیوں پیدا ہوتا ہے اور اس فساد کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔

ان تینوں باتوں کے بارے میں شاہ صاحب کا طریقۂ تحقیق علمائے عمرانیات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ شاہ صاحب کی تحقیقات بھی ان کی طرح طبعی علوم سے بے حد متاثر ہیں۔ ان سب میں شروع سے آخر تک ارتقاء کا نظریہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے تمام نظریات استقراء کا نتیجہ ہیں انہوں نے استقرائی نتائج نکالنے کے بعد حسب ضرورت استخراج سے بھی کام لیا ہے۔ ان دونوں میں ایک فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ شاہ صاحب اپنی تحقیقات شروع کرنے سے پہلے ایک مابعد الطبیعیاتی نظامِ فکر بناتے ہیں۔ ان کا یہ ماورائی نظامِ فکر آئندہ کی تحقیقات میں اساس کا کام دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کی تمام تحقیقات ایک نظام میں منسلک ہو جاتی ہیں۔ ابتداء میں انسان سے متعلقہ علوم کے ماہرین طبعی علوم سے بے انتہا متاثر تھے۔ نظامِ کائنات میں انسان کی حیثیت انھوں نے متعین نہ کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ طبیعات و حیاتیات کے اکثر قوانین اجتماعی زندگی پر منطبق کرنے لگے۔ شاہ صاحب چونکہ نظامِ کائنات کے متعلق ایک صحیح رائے قائم کرنے کے بعد اپنی تحقیقات کا کام شروع کرتے ہیں۔ اس سبب سے ان کے یہاں یہ غلطی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ اُن کے اور اجتماعیات

کے موجودہ ماہرین کے طریقہ تحقیق میں ایک اور فرق ہے۔ وہ یہ کہ شاہ صاحب کے زمانہ تک نہ تو علوم کی موجودہ تقسیم عمل میں آئی تھی اور نہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے دیکھتے تھے۔ اس لیے انسان کی زندگی سے متعلق تمام مباحث ان کے یہاں ملے جُلے ملتے ہیں۔ یہ اس زمانہ کا عام دستور تھا۔ شاہ صاحب بھی اس سے نہ بچ سکتے تھے۔ لیکن اس طریقہ کی وجہ سے ایک فائدہ بھی رہتا کہ محقق کے سامنے انسانی زندگی کے تمام پہلو آجاتے اور وہ کائنات کے متعلق ایک جامع تصور رکھتا۔ آج کی طرح نہیں کہ جو شخص زندگی کے معاشی پہلوؤں پر تحقیق کرتا ہے، اس کی نظر سے اخلاقی اور مذہبی پہلو اوجھل ہو جاتے ہیں اور جو شخص اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے وہ زندگی کے دوسرے جیتے جاگتے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اس طرح دونوں کے دونوں حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

معاشرہ کی ابتدا

شاہ ولی اللہ صاحب معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا سرچشمہ خود انسان کی ذات کو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک جماعتی زندگی بسر کرنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس کی طبیعت میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں، وہ جماعتی زندگی کی صورت ہی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ معاشرہ کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اجتماعی زندگی کے مختلف عناصر میں ارتقاء کا سلسلہ کس طرح جاری رہتا ہے۔ جماعتیں کس طرح بنتی ہیں اور کیونکر بگڑ جاتی ہیں؟ اور ایک صحیح اور مکمل معاشرہ میں کیا خصوصیات ہونی چاہئیں شاہ صاحب ان تمام سوالات کو انسانیت کے عام رجحانات اور اس کے فطری تقاضے سامنے رکھ کر حل کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جس اجتماعی فلسفہ کی طرف رہنمائی کی ہے، اس کا پوری طرح سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک "فطری تقاضے" کی اصطلاح اچھی طرح نہ سمجھ لی جائے۔ اس لیے اس پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فطری تقاضے

اشیائے کائنات میں ایسے رجحانات کا پایا جانا جن سے ہم ہونے والے واقعات اور نتائج کا اندازہ لگا سکیں، صرف انسان ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ رجحانات یا فطری تقاضے دنیا کی ہر شے میں نظر آتے ہیں۔ دنیا کا تمام کاروبار ان تقاضوں ہی کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک دنیا کا ہر واقعہ اشیاء کے فطری تقاضوں اور خارجی حالات کی کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک طرف خارجی حالات چیزوں کے نوعی تقاضوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے نوعی تقاضے طرح طرح کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ نوعی تقاضے اپنے ماحول میں تبدیلی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی کبھی امراض کی پیدائش کا باعث بنتی ہے اور کبھی اس سے جوہر وجود میں آتے ہیں۔ یہ ایک طلسم ہے جس سے کائنات کا کوئی واقعہ باہر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہر واقعہ کی تشریح اور ہر جاندار کے حقائق زندگی دریافت کرنے کے لیے ہمیں اس کے فطری تقاضوں کا کھوج لگانا چاہیئے اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اس کے فطری تقاضے اپنے اظہار کے لیے ماحول پر کس قسم کے نقوش ثبت کرتے ہیں اور ماحول ان فطری تقاضوں کے ظہور پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔

ایک جگہ فطری تقاضے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیں کائنات میں مختلف انواع و اقسام کی بے شمار اشیاء نظر آتی ہیں۔ فطرت نے ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی خصوصیتیں رکھی ہیں جو دوسری میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک شے دوسری سے دو باتوں میں ممتاز ہوتی ہے۔ ایک تو جسمانی خصائص میں۔ اشیاء کا جسمانی اعتبار سے مختلف ہونا ہر شخص بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ ہر

چیز کا رنگ، شکل صورت اور جثہ دوسری اشیاء سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان اور گھوڑے کو دیکھئے۔ ان میں سے ہر ایک کا ناک نقشہ اور چہرہ مہرہ دوسرے سے ممتاز ہے۔ ایک کا قد سیدھا ہے اور اس کے بدن پر بال کم ہیں۔ دوسرے کا قد سیدھا نہیں ہوتا۔ وہ چار پیروں پہ چلتا ہے۔ بدن پہ بال زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک میں نطق کی صلاحیت ہے۔ اور دوسرے میں نہیں ہے۔ گھوڑا بھی اپنا مافی الضمیر آواز کے ذریعے ظاہر کرتا ہے لیکن اس کی یہ صلاحیت انسان کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر اس کی آواز انسان کی آواز سے مختلف ہے ہم انسان اور گھوڑے کو نہ بھی دیکھیں، ان کی آوازیں دور ہی سے پہچان لیتے ہیں چیزوں کی یہ ظاہری خصوصیتیں ہیں۔ اپنی اس ظاہری ساخت اور جسمانی خصوصیات کے لحاظ سے ہر مخلوق کی فطرت میں مخصوص تقاضے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان خصوصیات کے پیش نظر وہ ایک خاص قسم کا سامانِ پرورش چاہتی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ ان میں بعض امتیازات ایسے بھی ہوتے ہیں جن تک ہر شخص کی نگاہ آسانی سے نہیں پہنچتی۔ حیوانات میں سمجھ بوجھ اور ادراک و شعور کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لیکن سب میں یہ ایک درجہ پر نہیں ہوتی۔ ہر حیوان کی اس صلاحیت کا دوسرے کے شعور و ادراک سے مقابلہ کرنے اور ان میں فرق معلوم کرنے کے لیے گہری نظر درکار ہے۔ بصیرت رکھنے والی نگاہیں ہی یہ معلوم کر سکتی ہیں کہ ہر جانور میں عقل و شعور کی صلاحیت کس حد تک موجود ہے۔ الغرض حواس و ادراک کی یہ ہدایت ہر حیوان کے لیے ایک ہی طرح کی نہیں ہے بلکہ ہر وجود کو اتنی ہی اور ویسی ہی استعداد دی گئی ہے۔ جیسی اور جتنی استعداد اس کے احوال و ظروف کے لیے ضروری تھی۔ چیونٹی کی قوتِ شامہ نہایت قوی اور دور رس ہوتی ہے اس لیے کہ اسی قوت کے ذریعہ وہ اپنی غذا حاصل کر سکتی ہے۔ چیل اور عقاب کی نگاہ تیز

ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ان کی نگاہ تیز نہ ہو تو بلندی میں اُڑتے ہوئے اپنا شکار نہ دیکھ سکیں۔

نوعی تقاضے

ادراک و شعور میں فرق کی بنا پر حیوانات کے طبعی رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے خاص قسم کے وسائل اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ جنہیں دوسری انواع استعمال نہیں کرتیں۔ شہد کی مکھی کی فطرت اسے بعض خاص درختوں اور پھول پتوں کا انتخاب کرنا اور انتخاب کرنے کے بعد چھتا بنانا، چھتے میں رہنے کا خاص اجتماعی طریقہ اختیار کرنا، یعسوب[1] کی نگرانی میں کام کرنا اور شہد جمع کرنا سکھاتی ہے۔ یہ سب کام اس کی فطرت کے مطابق ہیں۔ کسی دوسری نوع کو ان کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لیے فطرت نے انہیں یہ باتیں نہیں سکھائیں۔ پرندوں کا دانہ پانی کی تلاش کرنا، ایک خاص طرح پانی پر اترنا، بلی اور شکاری سے بچ کر نکل جانا۔ نر اور مادہ کا ایک مخصوص طریقہ پر انڈوں کو سینا اور بچوں کو چونگا دینا، یہ سب باتیں انہیں ان کی فطرت نے سکھائی ہیں اور ان سب کاموں کو ایک خاص نہج پر کرنا۔ ان کے فطری اور نوعی تقاضے ہیں۔ ایک نوع کے تمام افراد تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ چونکہ ایک ہی قسم کے کام اور کاموں کا ایک ہی سا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ہر نوع کی فطرت میں بعض خاص تقاضے ودیعت کیے گئے ہیں اور وہ ان کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں۔

دنیا کی تمام اشیا میں دو قسم کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ فطری تقاضے جو اس کی نوع میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان نوعی تقاضوں کے علاوہ ہر نوع کے افراد میں بعض ایسے فطری تقاضے بھی پائے جاتے ہیں جو ان

---

[1] شہد کی نر مکھی۔

کے علاوہ اور دوسری انواع میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان سب میں بحیثیت ایک جنس کے جو خصوصیات مشترک ہوتی ہیں، ان تقاضوں کو اس جنس کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ نباتات کو لیجئے، اس کی ہر قسم کے پتے ایک خاص شکل اور شگوفے ایک خاص رنگ کے ہوتے ہیں۔ حیوانات کی مختلف قسمیں بھی آپس میں ایسے ہی امتیازات رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان میں بعض وہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ جو نباتات میں نہیں ملتیں۔ ان میں با اختیار حرکت، ذاتی الہامات اور عملی تدابیر بھی پائی جاتی ہیں۔ ان باتوں کی بنا پر حیوانات کی مختلف قسموں میں بے شمار امتیازات پائے جاتے ہیں۔ چوپائے گھاس کھاتے ہیں اور جگالی کرتے ہیں لیکن گھوڑے، گدھے، خچر گھاس تو کھاتے ہیں۔ جگالی نہیں کرتے۔ درندے گوشت خوار ہیں، پرندے ہوا میں اڑتے ہیں۔ مچھلیاں پانی میں تیرتی ہیں۔ ہر جاندار کی آواز ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بچوں کو پالنے کا طریقہ جو ایک کا ہے، وہ دوسرے کا نہیں۔ ہر نوع کو فطرت نے وہی طریقہ سکھایا ہے جو اس کی طبیعت اور مزاج کے مناسب تھا اور جس سے اس نوع کی تکمیل اور درستی ممکن تھی۔ رنگ مزہ اور صورت کی بنا پر حیوانات میں جو تقاضے پائے جاتے ہیں۔ وہ ان کے خاص جنسی تقاضے ہیں۔ مگر یہ الہامات جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان کے ایسے ہی نوعی تقاضے ہیں جس طرح نباتات میں رنگ مزہ اور صورت ہیں۔

حیوانات سے آگے بڑھیئے اور انسان کو لیجئے۔ جو باتیں درختوں میں امتیاز اور اختلاف کا سرچشمہ تھیں، انسان میں وہ بھی پائی جاتی ہیں۔ اور بعض وہ بھی جن کی بنا پر ایک جاندار دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ انسان میں رنگ، شکل و صورت کے امتیازات بھی پائے جاتے ہیں۔ اور وہ بعض حیوانات کی طرح کھانسنے، ڈکارنے، مضرات کو دفع کرنے، پستان سے دودھ پینے کا بھی

ایک مخصوص طریقہ رکھتا ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو حیوانات اور نباتات میں نہیں ملتیں۔ حیوانات نہ گفتگو کرتے ہیں اور نہ اس طرح ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں جس طرح کہ انسان سمجھتا ہے۔ بدیہی مقدمات، تجربات اور استقراء کے ذریعہ معلومات حاصل کرنا بھی ایسی خصوصیت ہے جس میں نباتات اور حیوانات کی کوئی قسم اس کے ساتھ شریک نہیں۔ انسان مخلوقات کی ان دو بڑی قسموں کے برخلاف بعض ایسی باتیں بھی کرتا ہے جو اُسے نہ حواس خمسہ کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں اور نہ وہم و خیال سے۔ وہ ان امور کا اہتمام محض اس لیے کرتا ہے کہ انہیں اس کی عقل پسند کرتی ہے۔ نفسی کیفیات پر قابو پانا۔ بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنا انسان کی خصوصیات ہیں۔ یہ سب اس کے نوعی تقاضوں کی پیداوار ہیں۔ اگر یہ باتیں نوع انسانی کی فطرت کا تقاضا نہ ہوتیں بلکہ خارجی حالات کی بدولت معرض وجود میں آتیں تو انسانوں کی ہر آبادی میں خواہ وہ کسی بھی ملک اور مقام کی رہنے والی ہو، ان کا کسی نہ کسی طرح اظہار ہو کر رہنا ضروری نہ ہوتا۔ جمہور انسانیت کی تاریخ میں جو باتیں مشترک ہیں، انہیں انسانوں کے نوعی تقاضے مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نوعی تقاضوں کا اظہار تمام افراد میں نہیں ہوتا۔ ایسا ضروری بھی نہیں ہے۔ البتہ اس کے اظہار کی صلاحیت ہر فرد میں ضرور ہوتی ہے۔ ہر شہد کی مکھی یعسوب تو نہیں ہوتی لیکن یعسوب بننے کی صلاحیت ہر مکھی میں ہوتی ہے۔ اس صلاحیت کا انکار کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں ہے۔ بالکل ایسے ہی بعض انسانی تقاضے صرف چند انسانوں کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں پورا کرنے کی ہر ایک میں صلاحیت ہوتی ہے۔

غرض شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی زندگی یا دوسری مخلوقات

کی زندگی میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کا سرچشمہ فطری تقاضوں کو سمجھنا چاہیئے
اس طرح شاہ صاحب کے فلسفہ میں تقدیر کا مسئلہ بھی ایک حد تک عقلی اسبابِ علیہ
سے نجات پالیتا ہے۔ انہوں نے نوعی تقاضوں کی مدد سے اس مشکل مسئلہ کو حسن و خوبی
سے سلجھایا ہے۔ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:-

"قرآن حکیم کے ان دقیق مباحث میں سے ایک مسئلہ تقدیر
بھی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس مسئلہ پر
سیر حاصل بحث کی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جو شخص تقدیر
کے مسئلہ کو حجۃ البالغہ کے اصول پر حل نہیں کرسکتا وہ ولی اللّٰہی
حکمت سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے؟"

شاہ صاحب نے فطری تقاضوں کے ذریعہ تقدیر کا جو مفہوم واضح
کیا ہے اس سے جزا و سزا کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے۔ ان کے نزدیک جزا و سزا صورت نوعیہ
کا تقاضا ہے۔ چوپایہ کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے اور درندے کا یہ نوعی
تقاضا ہے کہ وہ گوشت سے اپنا پیٹ بھر لے۔ اگر یہ دونوں اپنے ان فطری
تقاضوں پر عمل کرتے رہیں۔ تو ان کا مزاج سلیم رہتا ہے۔ لیکن درندہ اگر
گھاس کھانے لگے اور چوپایہ گوشت تو ان کے اصلی مزاج میں فساد پیدا ہو
جاتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اس کے فطری تقاضے اس میں بعض خاص
قسم کی صفات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صفات اگر برقرار رہیں تو اس کا مزاج درست
رہتا ہے اور ان میں کمی پیدا ہوجائے تو اس کی نوعی حالت بگڑ جاتی ہے۔ اور
اسے ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسی ہمارے بدن کو جلنے سے ہوتی ہے۔ اس
طرح شاہ صاحب انسان کے نوعی تقاضوں کے ذریعہ اس کی مادی اور روحانی
دنیا کے ہر پیش آنے والے واقعہ کی تشریح کرتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کو سمجھنے

کے بیلے ان نوعی تقاضوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ شاہ صاحب ان کے ذریعہ ہی عالم اجتماعی کی حقیقتیں واشگاف کرتے ہیں۔ جن مخلوقات میں اجتماعی زندگی کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے وہ ان کے نوعی تقاضے دریافت کرتے ہیں جن کی بنا پر اجتماعی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ شاہ صاحب یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ مخلوقات میں اجتماعی زندگی کے مدارج کا جو اختلاف ہے وہ کن مختلف نوعی تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان کی اجتماعی زندگی کی بہت سی حقیقتیں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

حیوانات میں جماعت پسندی کے میلانات

شاہ صاحب کے عمرانی نظریات کا اصل موضوع بحث تو انسان کی اجتماعی زندگی ہے لیکن وہ اس سلسلہ میں ان اجتماعی مظاہر کی نشان دہی بھی کر جاتے ہیں جو ہمیں حیوانات کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اور دوسرے حیوانات کے فطری تقاضوں میں فرق معلوم کریں۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ مطالعہ کرنے سے نہ صرف ان کے فطری تقاضے اور ان کا باہمی فرق معلوم ہو جاتا ہے بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ فطری تقاضوں میں یہ فرق کن مختلف خصوصیات اور استعدادوں کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسانوں کی اجتماعی زندگی کا اختلاف اور اس کی وجوہات بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

حیوانات کی اجتماعی زندگی پر شاہ صاحب زیادہ روشنی نہیں ڈالتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کے زمانہ میں جانوروں کی زندگی کے بارے میں زیادہ تحقیقات نہ کی گئی تھیں۔ ان کا یہ کارنامہ ہی بہت ہے کہ انہوں نے آج سے دو صدی قبل انسان کی اجتماعی زندگی کو سمجھنے کے لیے کسی نہ کسی حد تک جانوروں

کی اجتماعی زندگی بھی اپنے سامنے رکھی تھی۔ یہ سب ان کی وحدت الوجود کی گتھیاں سلجھانے والی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ جو تمام کائنات میں ایک ہی قسم کا قانون جاری مانتی ہے۔ ان کے نزدیک مخلوقات جس حد تک آپس میں مشابہت و مماثلت رکھتی ہیں انہیں اس حد تک ایک ہی قانون اور ضابطہ کے مطابق ہونا چاہیئے اور جہاں سے ان میں اختلاف کی سرحد شروع ہوتی ہے ضروری ہے کہ ان کی نگرانی کرنے والا قاعدہ بھی علیحدہ ہو جائے۔ اس ذہنیت کا تقاضا ہے کہ حیوانات اور انسان کی اجتماعی زندگی کی تحقیقات ایک ساتھ شروع کر دی جائیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے ان مباحث کو سامنے رکھ کر عمرانیات کی موجودہ تحقیقات پر نظر ڈالیے تو ان میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق نظر آتا ہے۔ دونوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ اجتماعیات کے ماہرین بھی عمرانیات یا سوشیالوجی کا اصل موضوع بحث جماعت انسانی کو مانتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ حیوانات کی زندگی سے بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تنظیم اور جماعت پسندی کے جراثیم حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے ساتھ حیوانات کے اجتماعی رہن سہن کا مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت پسندی کا سرچشمہ خود اُن کی اپنی فطرت ہے۔ اُن کی اس فطرت کا اظہار ان میں اس وجہ سے مختلف مدارج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی شعوری یا ذہنی سطح ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ حیوانات کی جماعت پسندی اور انسان کی اجتماعی زندگی کا فرق سامنے رکھ کر عالم اجتماعی میں ارتقاء کا سلسلہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ماہرین عمرانیات ابھی یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ اجتماعیات کا علم حیوانات اور انسان دونوں کی اجتماعی زندگی

کو انتفاع کے ایک سلسلے میں پرو دینے پر پوری طرح قادر ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے ذریعہ ہمارے سامنے وہ بہت سے اجتماعی مظاہر آجاتے ہیں جو انسان اور دوسرے حیوانات میں قدر مشترک ہیں۔

شاہ صاحب نے معاشرہ انسانی کے پہلو بہ پہلو بعض جانوروں کی جماعت پسندی کا جو ذکر کیا ہے وہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ انہوں نے حیوانات کی اجتماع پسندی کی جو مثالیں دی ہیں اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ موجودہ تحقیقات نے اس ضمن میں اور بہت سا مواد جمع کر دیا ہے۔ گویا یہ مواد شاہ صاحب کے عمرانی نظریات کے اصولوں کی تفصیل ہے۔

شاہ صاحب نباتات میں عالم اجتماعی کے مظاہر کا ذکر نہیں کرتے۔ جدید تحقیقات نباتات کی بعض قسموں میں اجتماعی زندگی کے جراثیم کا پتہ دیتی ہیں۔ ماہرین نباتات نے تحقیق کی ہے کہ درخت اپنے آس پاس کے درختوں اور پودوں پر اثر ڈالتے ہیں۔ اور ان کی حیات نامی ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے درخت اپنے بڑے پڑوسیوں کے زیر سایہ پرورش پاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے یہاں عالم اجتماعی کے اس مظہر کا ذکر نہیں ملتا۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ علم نباتات میں خود ابھی اس موضوع پر زیادہ تحقیقات نہیں کی گئیں۔ عمرانیات میں اس بحث کو ابھی کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ ممکن ہے کہ آئندہ چل کر عالم اجتماعی کا یہ مظہر بھی عمرانی نظریات میں خاص اہمیت کا مالک بن جائے۔

نباتات کی اجتماع پسندی معرض بحث بن سکتی ہے لیکن حیوانات کی اجتماع پسندی میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جدید تحقیقات کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بعض جانوروں کی گروہ بندی میں عمرانی اصول نمایاں طور پر کارفرما

ہوتے ہیں اور بعض میں نسبتہً کم درجہ پر۔ یہ اختلاف ان میں شعور کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حیوانی جماعتوں کے یہ اوصاف ابتدائی حالت میں ہوتے ہیں جو ترقی کے ادنیٰ درجہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ انسانی معاشروں میں یہ اوصاف بھی پائے جاتے ہیں اور بعض دوسرے بھی۔ یہ سب حیوانوں کی بہ نسبت ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔

تمام جانور جماعت پسند نہیں ہوتے۔ گوشت خور جانوروں میں جماعتی زندگی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ یہ تنہا شکار کرتے اور تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ جو حیوانات گوشت نہیں کھاتے ان میں حفاظتِ نفس کے لیے تعاونِ عمل کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے۔ وہ خاندانی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ان میں اجتماعی زندگی کے ابتدائی آثار پائے جاتے ہیں۔ بعض مختلف قسم کے پرندے اتفاقاً ایک جگہ رہنے لگتے ہیں۔ اسے ہم ان کی جماعتی زندگی نہیں کہہ سکتے۔ صرف متحد النوع پرندے ہی اجتماع پسندی اور خانگی زندگی کی خاطر جماعتی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انتقالِ مقام کے وقت سب مل کر سفر کرتے ہیں۔

بارہ سنگھوں میں جماعتی زندگی کی خصوصیات ذرا بڑے پیمانہ پر ملتی ہیں۔ ان کا رہنما انہیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہاتھی پانچ سے ڈیڑھ سو تک کی جماعت میں رہتے ہیں۔ ان کی جماعتیں خاندانی رشتہ پر قائم ہوتی ہیں۔ بندر خاندان بنا کر رہتے ہیں۔ ان کی ایک خاص نوع (سرکوپتھی کس) اپنے لیڈر کی رہنمائی میں سیر و سیاحت کے لیے نکلتی ہے۔ ہر فرد لیڈر کا حکم مانتا ہے۔ لیڈر پاسبان مقرر کرتا ہے اور احکامات صادر کرتا رہتا ہے، جنہیں سب سمجھتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ بندروں کی ایک اور قسم (سائنو سیفلس) اس سے بھی بلند تر تنظیم اور جماعتی اداروں کی مالک دیکھی

گئی ہے۔

ڈارون کی تصریحات کے بموجب کسی حیوانی اجتماع میں اخلاقی احساس نہیں ہوتا۔ ان میں گزشتہ اور موجودہ حالات پر غور کرنے اور ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں ہوتی جس کے بغیر اخلاق کا احساس ممکن نہیں۔ ان حیوانات میں ایثار کا جذبہ بھی انسان کے مقابلہ میں کم ہوتا ہے اس لیے ان کی اجتماعی زندگی زیادہ ترقی نہیں پا سکتی۔

شاہ صاحب بھی حیوانات کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اجتماع پسند اور دوسرے غیر اجتماع پسند۔ فرماتے ہیں کہ جانور کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کیڑوں کی طرح زمین میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں فطرت غذا حاصل کرنے کا طریقہ تو سکھاتی ہے۔ لیکن انہیں تدبیر منزل کا طریقہ سکھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ نفاذ نسل کے لیے ان میں نہ مذکر و مونث کے ملنے کا کوئی خاص جنسی طریقہ ہوتا ہے اور نہ انہیں اولاد کی پرورش کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ان جانوروں میں اجتماعی زندگی کے ابتدائی آثار بھی نظر نہیں آتے۔ دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جو توالد و تناسل سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی پرورش کے لیے نر و مادہ مل کر کام کرتے ہیں۔ انہیں تمو نسلا حاصل کرنے، چلنے پھرنے، گھونسلا بنانے اور نر و مادہ کے جنسی کرنے کے طریقوں کے علاوہ فطرت کی طرف سے تدبیر منزل کا بھی الہام ہوتا ہے۔ ان میں فطری الہام کی بدولت ابتدائی شکل میں جماعتی زندگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان ان سب کے مقابلہ میں زیادہ مدنی الطبع ہے۔ وہ اپنے بنی نوع کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ نہ تو گھاس کھاتا ہے اور نہ کچے پھل کھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے بدن پر اتنے بال بھی نہیں ہوتے کہ وہ اسے سردی

اور گرمی سے بچا سکیں۔ یہ ضرورتیں انسان کو معاشرہ کا پہلا، دوسرا اور آخر تیسرا درجہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ کا دوسرا اور تیسرا درجہ (ان درجات کی بحث آئندہ مفصل آئے گی) انسان کی خصوصیت ہے۔ لیکن پہلا درجہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے بعض ذی شعور جانوروں میں یہ درجہ جس شکل میں پایا جاتا ہے، وہ بہت حد تک معاشرہ انسانی کی ابتدائی حالت سے مشابہ ہوتا ہے۔

جماعت پسندی کے اسباب

انسان اور حیوان کی اجتماعی زندگی کے محرکات بہت ہیں۔ یہ سب ان کی فطرت کا تقاضا ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں جو قدرتی طور پر ان دونوں کو جماعتی زندگی میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ شاہ صاحب ان اسباب کی بنیاد ان دو باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اول تو یہ کہ ہر جاندار شے اپنی زندگی اور جسم و جان کی حفاظت کرنا چاہتی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ نسل کی بقاء کی خواہش مند ہوتی ہے۔ یہ دونوں بنیادی جذبات انسان اور دوسرے حیوانات کی زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ حیوانات کی ظاہری شکل و صورت اور ان کا شعور و ادراک ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لیے ان میں مذکورہ بالا جذبات کی تسکین کے مختلف طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب سوسائٹی

اور معاشرہ کا سرچشمہ ان بنیادی جذبات ہی کو مانتے ہیں۔ اس لیے انسانوں اور مختلف حیوانات کے اجتماع اور سوسائٹی کی تشکیل اور اس کے اداروں کی تنظیم میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کی وجہ شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق ان سب کی شکل و صورت کے ظاہری اختلاف، ان کی سوجھ بوجھ اور ادراک

شعور کے فرق ہی کو سمجھنا چاہیئے۔ جن جانوروں میں شعور کم ہوتا ہے وہ اپنے بنیادی جذبات کی تسکین کے لیے صرف وجدان اور فطری تحریکات کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسے جانوروں میں اگر کوئی اجتماعی زندگی ہوتی ہے تو وہ بالکل ابتدائی شکل میں۔ لیکن جن حیوانات میں شعور زیادہ ہوتا ہے ان کی سوسائٹی پہلی قسم کے جانوروں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ البتہ ان کے اجتماع کا دارومدار بھی زیادہ تر فطری تحریکات پر ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے انسان کے فطری تقاضوں کو سمجھاتے وقت مقابلہ کے طور پر شہد کی مکھیوں اور پرندوں کی مثال کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ حیوانات کی ہر قسم اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک خاص قسم کا طریقہ استعمال کرتی ہے۔ یہ سب طریقے اس کے فطری وجدان پر مبنی ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں مناسب درخت تلاش کرتی ہیں۔ سب مل کر چھتا بناتی ہیں۔ ایک ساتھ رہتی ہیں اور ایک مکھی کا حکم مانتی ہیں۔ پرندوں میں بھی حفظِ زندگی اور بقاءِ نسل کے خاص طریقے ہیں۔ نر و مادہ انڈوں کے سینے اور بچوں کے پالنے کا کام مل کر انجام دیتے ہیں۔ ان میں اپنی نوع کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھی مادہ ہوتا ہے۔ ان کے یہ رجحانات خطرہ کے وقت نمایاں طور پر واضح ہوتے ہیں۔

انسان ظاہری شکل وصورت اور عقل وشعور میں دوسرے حیوانات سے بہت کچھ مختلف ہے۔ اس لیے فطرت کے ان بنیادی تقاضوں کے علاوہ اس میں کچھ اور خواہشات بھی ہیں جنہیں پورا کرنے کے لیے اس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان میں دو قسم کی خواہشات پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جو اس میں اور حیوانات میں مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کی مندرجہ ذیل

خواہشات آتی ہیں:

۱۔ حفظِ نفس :۔ بھوک، پیاس، سردی گرمی اور دشمن سے بچاؤ کے طریقے۔

۲۔ بقاءِ نسل : جنسی خواہش، عورت مرد کے تعلقات، اولاد، ماں باپ کا تعلق، اسی جذبہ کا مظہر ہیں۔

ان دونوں خواہشات کی تکمیل میں انسان کا گردوپیش، زمین کی طبعی حالت اور ملک کے جغرافیائی حالات رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں، جسے دُور کرنے کے لیے اسے باہمی تعاون اور تعامل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس طرح اس میں جماعت بندی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس احساس کے ارتقا میں اسے اپنے ابناءِ جنس سے ملنے کی خواہش اور نطق و گفتگو کی صلاحیت سے بہت مدد ملتی ہے۔

انسان میں شاہ ولی اللہ صاحب کچھ ایسی خواہشات بھی تسلیم کرتے ہیں جو حیوانیت سے بلند ہیں۔ یہ خواہشات انسان میں عقل و شعور کی زیادتی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ بہت ہیں۔ لیکن ان سب کی بنیاد شاہ صاحب تین خواہشات کو مانتے ہیں۔ یہ باتیں انسان میں اس کے نوعی تقاضوں کے ماتحت ایسی رکھی گئی ہیں، جو دوسرے حیوانات میں نہیں پائی جاتیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اس کے ہر کام کا سبب نظامِ اعصاب کی فوری تحریک نہیں ہوتی۔ اسے محض جسمانی لذات اور طبعی خواہشات ہی عمل پر نہیں اکساتیں۔ وہ اپنے اندر ان سے بالاتر چیزوں کی حاجت بھی پاتا ہے۔ اس کے بہت سے کاموں کے لیے عقلی تقاضے بھی محرک بنتے ہیں۔ اس کا حکمت آفریں دماغ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا اچھا نمونہ تخلیق کرتا ہے اور اپنی عملی جدوجہد کے لیے اس نمونہ کو نصب العین بنا لیتا ہے۔ تکمیلِ اخلاق اور تہذیبِ نفس

کے معیار اپنی نظر کے سامنے رکھتا ہے اپنے مستقبل کو روشن بنانے کے خیال سے وہ حال کے نقصانات اور مصائب برداشت کرتا ہے اور ان لذتوں اور فائدوں کو قربان کر دیتا ہے جو اس کی نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور جن کے حاصل ہونے میں اس کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ وہ عزت و شرافت اور خیر و شر کے متعلق نظریئے قائم کرتا ہے اور ان کی طلب میں سراپا جدوجہد بن جاتا ہے۔ وہ اپنے ان نظریوں اور ان پر عمل کرنے کو انسانیت کے لئے مفید خیال کرتا ہے۔ یا پھر اسے ان میں اپنے انجام کی بھلائی نظر آتی ہے۔ خدا کا خوف اور عذاب آخرت سے بچنے کی تمنا بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب انسان کی اس خصوصیت کو رائے کلی کے مطابق عمل کرنے کی خواہش سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ انسان دوسرے حیوانات کی طرح محض حفظ نفس اور بقاء نسل کی ابتدائی ضروریات پوری کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس ذیل میں اپنے مذاق لطیف اور ذوق جمال کو بھی تسکین دینا چاہتا ہے۔ اس کی حسن پرست نگاہیں ہر چیز میں حسن و جمال اور لطافت و خوبی کی طالب ہوتی ہیں۔ وہ لطافت و حسن کی کسی منزل پر ٹھہرنا نہیں جانتا۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل کی تمنا، ایک مرتبہ کے بعد کامل مرتبے کی تلاش و جستجو اس میں ہمیشہ جوش و ولولہ اور ہمت و عمل کی قوتیں بیدار رکھتی ہے۔ انسانیت کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی خواہشات کو بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھے طریقہ پر پورا کرنے کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہے۔ حیوانات کے لیے یہ بہت ہے کہ زندگی باقی رکھنے کے لیے انہیں بھوک رفع کرنے کا سامان مل جائے۔ مگر انسان اپنی فطرت کے اشارے پر ہر چیز میں لذت و حلاوت، فردوس گوش

اور جنت نگاہ کا متلاشی ہے۔ وہ ہر چیز میں تنوع کا طالب ہے۔ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی ہر چیز رنگ برنگ کی ہونی چاہیئے۔ تاکہ زندگی کی یکسانیت اس کے ذوقِ جمال پر بار نہ بن سکے۔

۳۔ ایک تیسری بات جو انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ حیوانات اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا طریقہ صرف اس وقت معلوم کر پاتے ہیں۔ جب انہیں فوری طور پر اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تعلیم کے فرائض صرف فطری الہامات انجام دیتے ہیں۔

اس کے برخلاف انسان کی فطرت میں علم کی پیاس ودیعت کی گئی ہے۔ وہ علم کو کمالِ انسانیت تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ انسان کائنات کی ہر چیز کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہے۔ اپنے اور کائنات کے تعلق کو سمجھتا ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ اس علم سے اس کو حفظِ نفس اور بقاءِ نسل کی خواہشات پورا کرنے میں فوری طور پر کوئی مدد ملتی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اگر وہ یہ معلومات حاصل نہ کرے تو اسے اپنی زندگی میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے فطرت نے انسان کو فطری الہامات کے علاوہ عقل و وحی کی نعمت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ انسان کے فطری الہامات اور عقل و وحی کے مدارج تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں مختلف استعدادیں ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنی ان استعدادوں کے مطابق مختلف معلومات حاصل کرتے ہیں۔ ان معلومات کی مدد سے انسان اپنی خواہشات پورا کرنے کے طریقے بدلتا رہتا ہے۔ جماعتی زندگی گزارنے کے بہتر سے بہتر طریقے نکلتے رہتے ہیں۔ بعض حاجتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بعض انسانوں کو نظر ہی نہیں آتیں۔ دوسرے انہیں اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو حاجتیں معلوم ہوتی

ہیں لیکن انہیں پورا کرنے کا طریقہ نہیں ملتا۔ ان سے اچھی صلاحیت رکھنے والے انہیں یہ طریقے بتاتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھا کر انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی رہتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ حفظ نفس اور بقاء نسل جیسے بنیادی جذبات کو پورا کرنے میں فطرت ہی دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی بھی رہنمائی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا وجدان سب سے بڑا معلم ہے۔ بچے کو کوئی یہ نہیں سکھاتا کہ وہ اپنی ماں کا دودھ کس طرح پیئے۔ اور نہ بالغ مرد و عورت کو یہ سکھانے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ بقائے نسل کا فریضہ کس طرح انجام دیں۔ چند بچوں کو اگر کسی ویران ملک میں چھوڑ دیا جائے۔ اور کھانے پینے اور سردی گرمی سے بچنے کا کوئی طریقہ انہیں نہ سکھایا جائے۔ تو وہ اپنے کھانے پینے اور سردی گرمی سے بچنے کا انتظام خود ہی سیکھ لیں گے۔ اس سلسلہ میں خود فطرت ان کی رہنمائی کرے گی۔

حیوانیت سے اوپر کے جذبات کو تسکین دینے کے لیے انسان کو مذاق عقل اور وحی تینوں سے رہنمائی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ انسانوں میں یہ صلاحیت ایک سی نہیں ہوتی۔ کسی میں کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ۔ جن میں یہ صلاحیت زیادہ پائی جاتی ہے وہی انسانی زندگی کا مرکز قرار پاتے ہیں۔

شاہ صاحب کی تعلیمات کی روشنی میں انسان جماعت پسند ہے اس لیے کہ حفظ نفس اور بقاء نفس کے لیے اسے جماعتی زندگی کی ضرورت ہے۔ نیز اس لیے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے طریقوں کو مذاق لطیف اور رائے کلی کے مطابق نہیں بنا سکتا۔ جب تک کہ وہ اجتماعی زندگی نہ بسر کرے۔ انسان کی جماعتی تنظیم حیوانات سے اس لیے مختلف ہے کہ بعض انسان علوم کو

محض اس لیے حاصل کرتے رہتے ہیں کہ ان سے اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے اور بعد میں یہ لوگ جماعتی تنظیم کو بہتر بنانے اور اسے انسانیت کی فلاح و بہبود کا کفیل بنانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ دوسرے حیوانات میں اجتماعی زندگی کی نشوونما اس طرح نہیں ہوتی۔ ان میں جماعت پسندی کے اظہار کا ذریعہ محض فطری الہامات ہیں اور بس۔ ان کی گروہ بندی میں عقل و شعور کی کارفرمائیاں نظر نہیں آتیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ انسانی کی ابتداء انسان کی فطرت سے ہوتی ہے۔ وہ جماعت پسندی کی خواہش کو انسان کا فطری تقاضا مانتے ہیں۔ انسان تمدن اجتماع سے کتنی دور ہی کیوں نہ نشوونما پائے، وہ حفظ نفس اور بقاء نسل کے بنیادی جذبات سے معری نہیں ہو سکتا۔ بھوک، پیاس، سردی اور گرمی سے بچنے کی ضرورت اور جنسی خواہشات اسے ستانے کے لیے ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ اگر اس کی فطرت میں کوئی نقص نہ ہو تو وہ یقیناً ایک عورت کی رفاقت تلاش کرنے پر مجبور ہے۔ اور اگر وہ دونوں طبعی طور پر تندرست ہوں تو ان کے اولاد بھی ضرور پیدا ہوگی۔ ان کی یہ اولاد ایک اچھی خاصی آبادی کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اگر یہ آبادی بس جائے تو پھر رفتہ رفتہ اس میں وہ تمام اجتماعی ادارے نشوونما پا جائیں گے جو متمدن انسانوں کا خاصہ نظر آتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آبادی میں ابتداءً معاشرہ کے ابتدائی

درجے وجود میں آئیں گے لیکن تجربات، ایجادات اور عقل کی رہنمائی انہیں معاشرہ کی تکمیل کے لیے جن اجتماعی اداروں کی ضرورت ہے۔ سب سے روشناس کر دے گی۔

معاشرہ اور ارتقاء

معاشرہ اور جماعت کی حقیقت سمجھنے اور ان کی نگرانی کرنے والے اصول و قوانین منضبط کرنے کے لیے ارتقائے جماعت کا تفصیلی مطالعہ بہت ضروری ہے۔ جب تک یہ بات ذہن نشین نہ ہو جائے کہ معاشرہ کی ابتدا نہایت سادہ صورتوں سے عمل میں آتی ہے اور اس کے تمام مظاہر و عناصر آہستہ آہستہ ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اس وقت تک ہم نہ معاشرہ اور جماعت کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ معاشرہ کے لیے ان کی ضرورت ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ عمرانیات کے ماہرین اسی لیے سب سے پہلے جماعت کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر ہر اجتماعی عنصر کی ارتقائی تاریخ کی روشنی میں وہ اصول معلوم کرتے ہیں جو معاشرہ کے عروج و زوال اور صلاح و فساد کا باعث بنتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے معاشرہ انسانی میں اصول ارتقاء کی کارفرمائی پر اتنی وضاحت اور صراحت کے ساتھ تو کہیں بحث نہیں کی۔ جس طرح کہ آج کل

عمرانیات میں ہوتی ہے۔ البتہ اجتماعی اداروں کے مختلف درجات مقرر کر کے انہوں نے جو مباحث مدوّن کیے ہیں، ان کے پیش نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ معاشرہ میں ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس خیال کی وضاحت اس وقت اور بھی ہو جاتی ہے جب ہمیں ان کے اجتماعی اداروں کے تذکرہ میں وحدۃ الوجود کے اثرات ملتے ہیں۔ وحدت الوجود کائنات میں ارتقاء کا قائل ہے! ورظاہر ہے کہ معاشرہ اس سے باہر نہیں۔ کائنات میں ارتقاء کی کارفرمائی معدنیات نباتات اور دوسری مخلوقات کے باہمی ربط کو سامنے رکھ کر سمجھائی جاتی ہے "تفہیمات الٰہیہ" جزو اول میں شاہ صاحب فرماتے ہیں،

"ہر زمانہ میں نیا ظہور ہوتا ہے اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں۔ اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں مشیّت الٰہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا۔ معدنیات کے بعد عالم نباتی قدرت حق کا محور بنا۔ نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا۔ اور پھر انسان کی شکل میں ارادۂ حق کا ظہور ہوا"

وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہمیں بتاتا ہے کہ نظام عالم ترقی پذیر ہے وہ ابتدائے آفرینش سے اب تک سینکڑوں قالب بدل چکا ہے۔ جمادات ارتقائی قوتوں کے ذریعہ نباتات کی شکل اختیار کرتی ہیں اور نباتات کے بعد حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے۔ حیوانات کی ارتقائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد نمودار ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب مخلوقات کے ان ارتقائی مدارج ہی کی مثال سے اجتماعی اداروں یا انسانی معاشرہ کے مختلف درجات کا باہمی ربط و تعلق سمجھاتے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرہ انسانی

میں ارتقاء کو اسی طرح کار فرما مانتے ہیں، جس طرح کائنات کے دوسرے مظاہر میں" بدو ریاز غد میں فرماتے ہیں:۔

" انسانی معاشرہ کے ابتدائی درجہ میں اجتماعی اداروں کی تشکیل جانوروں کے اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ فرق اتنا ہے کہ حیوانات میں یہ ارتفاق بطور اجمال پایا جاتا ہے! انسانوں میں آکر یہ پوری طرح نشوونما پاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی حیوانات کے اجتماع کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور بلند درجہ ہوتا ہے۔ حیوانی معاشرہ کے بعد معاشرہ انسانی کا یہ ابتدائی درجہ بالکل اس طرح وجود میں آتا ہے جیسے عناصرِ کائنات سے جمادات پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں معاشرہ کا دوسرا درجہ پہلے درجہ کے بعد آتا ہے۔ اس سے پہلے نہیں آسکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھنا چاہیئے جیسے جمادات کے بعد نباتات کا آنا۔ انسانی معاشرہ کے اس درجہ میں پہلے درجہ کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں لیکن اب ان میں لطافت، عمدگی اور بہتر تنظیم پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے درجہ کے بعد معاشرہ انسانی کے تیسرے درجہ کا آنا نباتات کے بعد حیوانات کی تخلیق کے مانند ہے۔ جس طرح حیوانات میں نباتات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس تیسرے درجہ میں دوسرے درجہ کی صفات بھی ہوتی ہیں لیکن ذرا مختلف شکل میں حیوانیت کے بعد انسانیت کی منزل آتی ہے۔ ارتفاقات (اجتماعی اداروں) میں اس کی مثال تیسرے اور چوتھے درجہ کو سمجھنا چاہیئے۔"

ادارات اجتماعی کے مندرجہ بالا چار درجات کی تفصیل تو آئندہ اپنے

مقام پہ آئے گی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ الوجود کے ذہن سکے تحت معاشرہ انسانی کو جامد نہیں بلکہ ارتقاء پذیر مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ سے اس حالت پر نہیں رہے جس میں آج نظر آتا ہے۔ اس درجہ تک وہ بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ انسانی معاشرہ میں پہلے اتنی بہتر تنظیم اور خوبی ترقی جتنی کہ آج پائی جاتی ہے۔ انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ جتنی قوت کا آج مالک ہے اس سے پہلے نہ تھا۔ شاہ صاحب نے ارتفاقات کے عنوان سے جو مباحث مدون کیے ہیں، ان کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں اصول ارتقاء کی کارفرمائی ثابت ہوتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ارتقائے جماعت میں کون کون سی باتیں مدد دیتی ہیں۔ اور انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ کس طرح ترقی کرتا ہے۔

نوعی تقاضے اور ارتقا

انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ ان اعمال و افعال کے ذریعہ تربیت پاتا ہے جو اجتماعی طور پر انجام دیے جاتے ہیں۔ انسانوں کے یہ عمل بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی کا نتیجہ اجتماعیت کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ہر اجتماعی عمل ایک جماعتی منظر کی تشکیل کرتا ہے۔ مظاہر اجتماعی کا تنوع ہی ارتقائے جماعت کا کفیل ہے۔ مختصر یہ کہ اجتماعی اعمال و افعال ارتقائے معاشرہ کا زینہ ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انسان بعض خاص کام کیوں کرتا ہے اور اس کے یہ اعمال اپنی شکلیں کیوں بدلتے رہتے ہیں۔ تو ہماری نگاہ سے ارتقائے جماعت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب انسان کے انفرادی اور

اجتماعی نظام کا سرچشمہ اس کے نوعی اور جنسی تقاضوں کو قرار دیتے ہیں۔
ان کی کتابوں میں فطری تقاضوں کی بحث کو اگر مبحث ارتفاقات و اجتماعی اداروں
کی بحث سے ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے
نزدیک معاشرہ انسانی کا ارتقاء بھی انسان کے فطری تقاضوں کا رہین منت ہے۔
انسان کے فطری تقاضوں میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے۔ وہ سب ایک
درجہ کے نہیں ہیں۔ بعض تقاضوں کو پورا کیے بغیر انسان زندہ نہیں رہتا۔ اس لیے
سب سے پہلے ان کی ہی تکمیل ضروری ہے۔
ایک خاص حد تک جب ان کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ تب کہیں دوسرے
تقاضوں کی باری آتی ہے۔ انسان نے اپنے فطری تقاضوں کو کمال حسن و خوبی
کے ساتھ پورا کرنا رفتہ رفتہ سیکھا ہے۔ وہ ابتدا میں صرف اپنی حیوانی خواہشات
پوری کرتا تھا۔ وہ بھی نہایت ابتدائی شکل میں۔ کیونکہ وہ فطرت کے خزانوں
سے ناواقف تھا۔ اور کائنات کی قوتیں اس کے قابو میں نہ آتی تھیں۔ جوں جوں
وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرتا گیا۔ اپنے فطری تقاضوں کو اچھی سے اچھی طرح
پورا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوتی گئی اور آخرکار اس کی حیوانی خواہشات
پورا کرنے کے طریقوں میں حسن و لطافت کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس طرح اسے
جنسی تقاضوں کے علاوہ اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل پر بھی قدرت حاصل ہو گئی۔
شاہ صاحب نے بہت جگہ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ خارجی حالات کا انسان
پر اور اس کے فطری تقاضوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔
بدلتے ہوئے حالات ہر مرتبہ فطری تقاضوں کو ایک نئی شکل دیتے ہیں۔ فطری
تقاضوں کی یہ نئی شکل خارجی حالات کو دوبارہ بدل دیتی ہے اور یہ نئے فطری تقاضوں
کو پھر دوسری شکل دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اس طرح معاشرہ

برابر ترقی پذیر رہتا ہے۔

انسانی اور حیوانی معاشروں میں ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ معاشرہ انسانی میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کے ارتقاء کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس کا سبب انسان کے چار فطری تقاضے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔ ان فطری تقاضوں کی بنیاد مذاق لطیف، رائے کلی اور علم و تجربہ کی پیاس کو قرار دیا ہے۔ غور سے دیکھئے تو انسانی معاشرہ میں ترقی کی تیز رفتاری اور ارتقائے جماعت کا اٹوٹ سلسلہ ان کے دم ہی سے قائم ہے۔ انسان کی فطرت کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید انسانی معاشرہ کبھی ترقی کے منازل طے نہ کرتا یا اگر ان میں تبدیلی ہوتی تو محض حالات کے بدل جانے سے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، وہ اپنی ضروریات کو لطافت اور عقلی نظریات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ ضروریات پورا کرنے کا جو طریقہ اس کے مذاق لطیف کو نہیں بھاتا، اس کے عقلی نظریات پر پورا نہیں اترتا۔ اور اس کے پہلے سے حاصل کیے ہوئے علوم و تجربات کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے عمدہ اور مفید طریقوں کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتی ہے۔ اس کی بے چین طبیعت اس وقت ہی اطمینان کا سانس لیتی ہے جب اسے یہ طریقے معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان طریقوں کی دریافت جو نئے حالات پیدا کرتی ہے، ان میں بھی اسے سکون نہیں ملتا۔ وہ اس منزل پر ٹھہرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس مقام پر زیادہ نہ ستائے۔ بلکہ جلد ہی دوسری منزل کی طرف قدم بڑھائے۔ خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی یہ تڑپ انسان کو کبھی ایجادات و اختراع کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ وہ یہاں پہنچ کر اپنے استعمال کے لیے نئی نئی چیزیں بناتا ہے۔ اپنی جماعت کا نظام چلانے کے

لیے بہت سے بہتر ترکیبیں ایجاد کرتا ہے۔ اور اپنی ہر قسم کی ضروریات پورا کرنے کے لیے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا رہتا ہے۔ کائنات کی یہ تسخیر اس کے جماعتی نظام کو یکسر بدل دیتی ہے اور اسے جماعتی نظام کا دوسرا ڈھانچہ تیار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ عقلی نظریات، رائے ثمل اور علوم و تجربات کے وسائل سے کام لیتا ہے اور غور کرتا ہے کہ اس کی جماعت کن بنیادوں پر قائم ہے۔ اور انسانی معاشرہ کی بنیاد کن باتوں پر ہونی چاہیئے۔ وہ علیحدہ علیحدہ معاشرے کے ہر ہر مظہر پر غور کرتا ہے۔ انقلاب اُمم کی داستان اس کے سامنے رہتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کیے جاتے ہیں۔ جماعت کے لیے ایک صالح نظام تیار ہوتا ہے اور یہ کسی ایک گروہ کا نصب العین بن جاتا ہے۔ اس نصب العین سے عقیدت رکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس طرح یہ ایک انقلابی تحریک بن جاتی ہے۔ اس انقلاب کی کامیابی پر جماعت کا نظام بدل جانا یقینی ہے۔ ایجادات و اختراعات اور عقلی نظریات ہی وہ انقلابی مظاہر ہیں جو انسان کے نوعی تقاضوں کی تحریک پر وجود میں آتے ہیں اور انسان کے معاشرہ میں ترقی اور ارتقاء کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں کا ذرا تفصیل سے مطالعہ ضروری ہے۔

ایجادات و اختراعات

ایجاد و اختراع کے اظہار کا میدان فطرتِ خارجی ہے۔ ہر زمانے میں اور ہر مقام پر انسان اور فطرت کے خارجی مظاہر میں کشمکش نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان کو حفظِ نفس اور بقاء نسل کے لیے سردی، گرمی، وحشی جانوروں، دریاؤں، جنگلوں اور زمین کی قوتوں سے برسرِ پیکار رہنا پڑتا تھا

اس کش مکش نے فطری طور پر اسے ایسے طریقے دریافت کرنے اور ایسے اوزار ایجاد کرنے پر مجبور کیا جن کے ذریعہ وہ فطرت کے ان خارجی مظاہر پر قابو پا سکے۔ ابتدائی معاشرے میں زندگی بہت سادہ تھی اور انسان کی ضرورتیں فطرت کے چند سر چشموں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ انسان اس وقت جڑیں، جڑی بوٹیاں کھاتا، چٹانوں اور غاروں میں رہتا۔ اور درخت کے پتوں سے اپنا بدن ڈھک لیتا تھا۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک اپنی ان ایجادوں پر قناعت نہیں کر سکا۔ اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ فطرت کے بے پایاں سرمائے پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کرتا جائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں ایجاد کرتا رہے۔ آخر اس تمام جدوجہد کی انسان کو کیوں ضرورت پیش آئی؟

شاہ ولی اللہ صاحب اس کا بڑی وضاحت سے جواب دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ انسان کے دو فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ ایک تو علم و تجربات کی خواہش انسان کو کائنات کی ہر شے کی حقیقت کی تلاش اور دنیا کی ہر چیز کے خصائص اور امتیازات کی جستجو میں سرگرداں رکھتی ہے۔ وہ ہر اس نئی چیز کو جسے وہ پہلی مرتبہ دیکھتا ہے، نہایت غور و خوض سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اشیاء کائنات کے بارے میں اس کا مطالعہ روز بروز وسیع ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے وہ ہمیشہ ہر چیز میں لطف و خوبی اور حسن و نزاکت تلاش کرتا ہے۔ اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے طریقوں کو ہمیشہ بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں جذبے انسان کو ہمیشہ نت نئی دریافتوں اور جدید سے جدید ایجادوں پر اکساتے رہتے ہیں۔ اس طرح ایجادات کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔

شاہ صاحب نے اجتماعی زندگی میں ایجاد و اختراع کی حیثیت و اہمیت پر کسی جدا عنوان کے ماتحت بحث نہیں کی۔ لیکن کسی اجتماعی ادارے کو ایک درجے سے

دوسرے درجہ تک پہنچنے میں جدید دریافتوں اور نئی ایجادات کے ذریعہ جو مدد ملتی ہے۔ شاہ صاحب اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ ارتفاقات کا بیان ارتقائے معاشرہ کے اس پہلو پر کافی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے، وہ ہر اس موقع پر جب معاشرہ ایک درجہ سے بلند تر درجہ کی طرف ترقی کرتا ہے بعض اہم ایجادات اور ضروری دریافتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی معاشرہ کی پہلی منزل میں کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ انسان کی ایجاد و اختراع کی صلاحیت اسے برابر بدلتی رہتی ہے۔ معاشرہ کو درجہ اول کی تکمیل تک پہنچنے میں جن اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور جنہیں وہ ایجاد اور اختراع کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، بہت ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ارتفاقات کے مباحث میں ان کی ایک فہرست تحریر فرمائی ہے جسے ہم مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ زبان ۲۔ مکان ۳۔ لباس ۴۔ پکانے کے طریقے
۵۔ برتن بنانا ۶۔ جانوروں کی تسخیر ۷۔ کاشت کاری ۸۔ ایسی صنعتیں جن پر کھیتی کا دارومدار ہے جیسے کدال، ڈول، ہل، رسی وغیرہ۔

معاشرہ کی ابتدائی منزل میں انسان ان چیزوں کو معمولی شکل میں حاصل کرتا ہے لیکن نیک سے نیک تر کی جستجو انسان کو ان چیزوں کو بہتر سے بہتر شکل میں حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لیے وہ ان میں سے ہر چیز کو عمدہ سے عمدہ شکل میں بنانا سیکھتا ہے اور اس کی ضرورتیں برابر بڑھتی رہتی ہیں۔ ایک منزل ایسی آتی ہے کہ کوئی شخص یا خاندان خود اپنی ان تمام ضرورتوں کی اشیاء تیار اور فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لیے معاشرہ میں مبادلہ، امداد باہمی اور اجرت و کسب میں مدد دینے والی اشیاء دریافت ہوتی ہیں اور معاشرہ دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اس جگہ پہنچ

کر ترقی رفتار پہلے سے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اور اب انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں پر علم و تجربہ کی روشنی میں نظرِ ثانی کی جاتی ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ایک مستقل حکمت اور فن مرتب ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیشوں میں تنوع اور کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ پیشوں کی یہ کثرت اور تنوع ایجاد اور اختراع کی رفتار تیز کر دیتی ہے اور اب معاشرہ میں اتنے مختلف مفاد رکھنے والے پیشے معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں۔ کہ ان کی اور اس نظام کی حفاظت کے بغیر جس کے گرد یہ پیشے نشوونما پاتے ہیں، انسانی زندگی کی بقا مشکل ہو جاتی ہے ایک مستحکم سیاسی نظام کی یہ ضرورت معاشرہ کو ایک تیسری منزل میں داخل کر دیتی ہے۔ نظام کے استحکام کے بعد ایجاد و اختراع کی رفتار میں نسبتاً اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح معاشرہ نئی نئی ضروریات پورا کر کے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس منزل میں ایجادات و اختراعات اور نظامِ معاشرہ میں ایک خاص ربط و تعلق اور موزونیت و مناسبت کی ضرورت رہتی ہے۔ جب کبھی یہ توازن بگڑتا ہے اس کا اثر معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی نظام پر پڑتا ہے اور اس میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

عقلی نظریات

انسان کی حاجتیں محض طبعی اور جسمانی نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنے اندر ایسی خواہشات بھی پاتا ہے۔ جنہیں پورا کرنے کے لیے عقلی نظریات تحریک کا کام دیتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اس کا ایک خاص نظریہ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ڈھانچہ کو اپنے اس عقلی معیار پر ڈھالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور زندگی کے صرف اُن پہلوؤں کو باقی رکھنا چاہتا ہے جو خیرِ مطلق کے حامی ہوں۔ اور رائے کل کے تقاضے

پورا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں۔ وہ اس عقلی معیار کی تصویر اپنے ذہن میں زیادہ واضح اور صاف شکل میں قائم کرنے کے لیے علمی تجربات اور معلومات کے ذخیرہ سے کام لیتا ہے۔ عقلی نظریات قائم کرنے کا یہ کام ہر انسان انجام نہیں دے سکتا۔ اس فرض کو ادا کرنے کی صلاحیت فطرت کی طرف سے چند برگزیدہ شخصیتوں ہی کو حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے کام لے کر معاشرہ کے ہر مظہر کی اچھائی برائی اور رسم و رواج کے ہر حسن و قبح کو پرکھنے کے بعد انسانیت کو ایک صالح نظام کی دعوت دیتے ہیں۔ جمہور ان برگزیدہ اشخاص کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اور معاشرہ کی برائیاں دور کرنے کی کوشش شروع ہوتی ہے۔ صرف ان چیزوں کو باقی رکھا جاتا ہے۔ جو انسانیت کے فلاح کا سرچشمہ ہوں اس طرح چند لوگوں کے عقلی اور رائے کلی کے مطابق نظریات معاشرہ کو یک سر بدل دیتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق لوگوں کے پیش نظر حسن و لطافت کے مختلف معیار ہوتے ہیں۔ اکثر جماعتیں زندگی کے کسی ایک پہلو میں حسن و لطافت کی اس قدر دل دادہ ہو جاتی ہیں کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں اور حسن و لطافت کے دوسرے معیاروں کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس وقت ان جماعتوں کو کسی ایسے حکیم کی ضرورت پیش آتی ہے جو اُن کی حالت کو رائے کلی اور خیر مطلق کے معیار پر پرکھ کر دیکھے۔ اُن میں سے جو باتیں غلط ہوں انھیں دُور کرے اور جو معاشرہ کے لیے مفید ہوں، انہیں باقی رہنے دے۔

عقلی نظریات اور رائے کلی کے معیار پر چیزوں کو پرکھنے والے یہ حکیم شاہ صاحب کے نزدیک دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو رائے کلی اور مصلحت کلیہ کو ادراک و فہم اور عقل و شعور کی استدلالی قوتوں سے معلوم کرتے ہیں، اور دوسرے وہ جن کی قوتِ ملکیہ اتنی زبردست ہوتی ہے کہ ان کا ذہن و خیال کسی ایسی بات کی

طرف پہنچنے ہی نہیں پاتا جو رائے کُلی اور خیر مطلق کے خلاف ہو اور ان کے وجدان پہ یہ حقیقت یک بارگی منکشف ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کے حکماء پہلے گروہ سے زیادہ قابلِ وثوق اور لائقِ ترجیح ہوتے ہیں۔ پہلے گروہ والے عقل و ادراک رائے کلی اور خیر مطلق کی دریافت میں غلطی کر سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کی قوتِ ملکیہ جس بات کو مصلحتِ کلیہ اور خیر مطلق کے موافق بتائے، اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسانی ضروریات پورا کرنے کے لیے جو اجتماعی ادارے قائم ہوتے ہیں، مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کا ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے اور ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان خرابیوں کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جماعت کی رہنمائی اور نظامِ معاشرہ کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو خیر مطلق اور رائے کلی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی بہیمانہ خواہشات کو پورا کرنے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتے ہیں۔ جماعت کی اکثریت ان کی پیروی کرنے لگتی ہے اور اس طرح تہذیب و تمدن کی بنیادیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ایسے موقعے پر معاشرہ کو ہلاکت اور تباہی سے بچانے کے لیے فطرت کچھ ایسی طاقتور شخصیتیں پیدا کرتی ہے جو انسانیت کا کھوٹ دُور کر کے اسے دوبارہ نکھار دیتی ہیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد انسانیت کو خدا کی عبادت اور بندگی کے طریقے سکھانے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ تہذیب و تمدن کے خراب اور تباہ کن رسم و رواج کا خاتمہ کریں اور ان کی جگہ لوگوں کو صحیح قسم کے اجتماعی ادارے قائم کرنے کی ترغیب دیں۔ ان کے اس وعظ و نصیحت کا نتیجہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یہ نکلا ہے کہ انسانی معاشرے نے حق و صداقت کی نئی بنیادوں پر قائم ہو کر ترقی و ارتقاء کے مدارج نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طے

کرتے رہے ہیں۔

تقلید

معاشرہ کی نشوونما میں تقلید کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تقلید اگر انسان کی جبلی خصوصیت نہ ہوتی تو معاشرہ کی تکمیل میں کافی زمانہ لگتا۔ اور بہت ممکن ہے، انسانی معاشرہ کبھی اپنی ابتدائی شکل سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ لوگوں میں جماعتی صلاحیت اس لیے ترقی پاتی ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کی اجتماعی خصوصیات عام ہوتی ہیں۔ اور ان سے ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ ان خصوصیات سے عام دلچسپی جماعت کے افراد میں جماعت پسندی کے جذبہ کو بہت مضبوط کر دیتی ہے۔

تقلید پسندی انسان میں ابتدائے عمر سے آخر تک رہتی ہے۔ معصوم بچے کی ابتدائی ذہنی زندگی اس جبلت سے متاثر ہوتی ہے۔ غرضیکہ ہم اپنے عمرانی معاشرے کی حتی المقدور پیروی کرتے ہیں اور ہمیشہ اجتماعی ذہنیت کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ہماری تجدید حقیقت میں عمرانی حالات میں ایک ترمیم ہوتی ہے جسے ضرورت وقت نے ممکن کر دیا ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس سلسلہ میں یہ بات بڑی وضاحت سے بیان فرمائی ہے کہ انسان کو تقلید کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے اور وہ آسانی کے ساتھ دوسرے کی تقلید پر کس طرح آمادہ اور تیار ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان عقل لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ حسن و لطافت کی جستجو، مفید تدبیروں کی ایجاد، اصول و قواعد کی پیروی اور غور و فکر کے لیے فرصت میسر آنے اور نہ آنے کے اعتبار سے ہر شخص

دوسرے سے مختلف ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں نہ تو یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی اداروں کے متعلق غور و عوض کر سکے اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے اس لیے یہ کام بعض اہل عقل اور صاحب فہم انسانوں کے لیے مخصوص رہتا ہے۔ یہ لوگ معاشرہ کے ہر پہلو کے متعلق نصب العین اور اصولی نظریے بناتے ہیں۔ معاشرہ کی ضروری اشیاء کے سلسلہ میں نئی نئی ایجادیں اور دریافتیں کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے آدمیوں میں ان جیسی عقل و فکر تو ہوتی نہیں البتہ ان حضرات کے پیشِ نظر جو ضرورتیں ہوتی ہیں، ان کا احساس ان کو بھی ہوتا ہے، اس لیے وہ ان مفکرین اور موجدین کی تقلید میں ان تمام باتوں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔ بونے، جوتنے، آبپاشی، فصل کاٹنے، غلہ صاف کرنے اور کھانا پکانے کے طریقے جو آج دنیا کے ہر حصہ میں مقبول ہیں، یہ ہر انسان نے علیحدہ علیحدہ ایجاد نہیں کیے۔ بھوک پیاس کی ضرورت ہر شخص کو محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ابتداءً معاشرہ میں انسانوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی خاص طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا۔ لوگ جس طرح بن پڑتا تھا اس ضرورت کو پورا کر لیتے۔ لیکن پھر بعض عقلمند اور سمجھ دار لوگوں نے زمین کی کاشت وغیرہ کے طریقے ایجاد کر لیے۔ آب پاشی کے لیے کنوئیں بنائے۔ نہریں نکالنے کی ترکیبیں سوچیں۔ کچا غلہ جلد ہضم نہیں ہوتا تھا اور نہ اتنا لذیذ تھا اس لیے پکانے کی تدبیریں نکالیں۔ یہ کام دنیا کے تمام آدمیوں نے انجام نہیں دیے۔ لیکن ان کی ضرورت کا احساس ہر شخص کو تھا اور جب یہ ایجادات ہو گئیں تو ہر شخص نے ان سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید کی اس اہمیت اور ضرورت کا رسوم کے بیان میں بھی ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اخلاق اور تدابیر نافعہ پر عمل کرنے کا

مدار ہر شخص کی طبیعت اور سمجھ کو بنایا جاتا تو ہر انسان کو ایک عرصہ تک ایک ہی قسم کا فعل کرتے رہنا پڑتا اور پھر اس تجرباتی زندگی میں اگر کبھی اخلاق صالحہ اور تدابیر نافعہ تک اس کی رہنمائی ہوتی تب کہیں وہ اس قابل ہو سکتا کہ اپنی جامد زندگی سے آگے قدم بڑھا سکے۔ اس طرح انسانیت کو ترقی کے مدارج طے کرنے میں ایک لامنتہا ہی عرصہ کی ضرورت پیش آتی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص اخلاق صالحہ اور تدابیر نافعہ کی خود تلاش کرتا ہو۔ یہ کام ایک مخصوص جماعت انجام دیتی ہے۔ اور دوسرے لوگ اس کی تقلید کرتے ہیں۔ عوام اپنے سے بلند قسم کے لوگوں کی بات آسانی سے اس لیے مان لیتے ہیں کہ ان کی عقل کی مثال آئینہ ایسی ہے۔ جس میں دوسروں کے دریافت کئے ہوئے اخلاق صالحہ اور تدابیر نافعہ کی صورتیں نقش ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ علمی طور پر ان کی ضرورت اور خوبی کو بیان نہیں کر سکتے۔ البتہ انہیں غیر شعوری طور پر اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کے معلوم ہونے کے بعد اگر وہ ان پر عمل نہ کریں تو انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رائے کلی اور مذاق لطیف کے مطابق خواہشات پورا کرنا انسان کی فطرت ہے۔ خواہ وہ خود یہ طریقے دریافت کرے یا کسی کی رہنمائی کے ذریعہ اسے یہ طریقے معلوم ہوں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عامۃ الناس ان لوگوں کی تقلید پر فطرتاً مجبور ہیں۔ جن میں اخلاقِ صالحہ اور تدابیر نافعہ کو دریافت کرنے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک تقلید کی صفت جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک کبوتر اپنی نوعی ضرورت پورا کرنے کے لیے کوئی نیا کام کرتا ہے تو اس کی دیکھا دیکھی دوسرے کبوتر بھی یہ کام کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے کبوتر کو اس کام کے کرنے پر جو شئے آمادہ کر سکتی ہے وہ اس کی نوعی

خواہشات ہی ہو سکتی ہیں۔ اسے پہلے کبوتر کا فعل غیر شعوری طور پر نوعی خواہشات کو پورا کرنے کا صحیح ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور وہ اس کی تقلید کرنے لگتا ہے۔

دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو نکاح وغیرہ کے قواعد پر پوری سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن اگر ان سے اس کی وجہ پوچھی جائے تو وہ اس کے سوائے کچھ نہ بتا سکیں گے کہ ان کے آباؤ اجداد بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ ان کا تقلید کا جذبہ ہی ہے جو ان سے ان اعمال کی سختی سے پابندی کراتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان دو قسم کے آدمیوں کی تقلید آسانی کے ساتھ کرتا ہے۔ ایک تو ایسے شخص کی جو قوت و اقتدار کا مالک ہو جس کی سطوت اور شوکت کے سامنے تمام رعایا کے سر تسلیم خم ہو جائیں اور دوسرے ان عظیم الشان شخصیتوں کی تقلید بھی انسان بہت آسانی کے ساتھ کرتا ہے جن کو وہ ایک مُصلح اور مُدبّر کی حیثیت سے مان چکے ہوں۔ اور ان کی نصیحتوں کو بارہا انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا ہو۔

معاشرہ کی چار منزلیں

انسانی معاشرہ جن منزلوں سے گزر کر کمال کی طرف قدم بڑھاتا ہے' ارتقائے جماعت کا صحیح علم حاصل کرنے کے لیے ان منزلوں سے پوری طرح واقفیت نہایت ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ منزلیں چار ہیں۔ زندگی کی ابتدائی شکل سے اب تک انسان نے اجتماعی اداروں کے چار درجے قائم کیے ہیں۔ یہ انسانی معاشرہ کے چاروں درجے ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ دوسرا درجہ پہلے درجہ سے تیسرا درجہ دوسرے درجے سے اور چوتھا درجہ تیسرے درجہ سے قبل وجود میں نہیں آ سکتا۔ سوسائٹی ارتقا کے ہر اگلے زینہ پر اس وقت قدم رکھتی ہے۔ جب کہ اس نے پہلا زینہ طے کر لیا ہو۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر اگلا درجہ اس وقت تک نہ آئے جب تک پہلا درجہ ہر اعتبار سے مکمل نہ ہو جائے اور اس کا ہر پہلو حسن و خوبی کے معیار پر پورا نہ اتر جائے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ کے ہر درجہ میں دو قسم کے عناصر

ہوتے ہیں۔ بعض عناصر اس درجے کے ایسے ارکان کہلاتے ہیں کہ ان کے بغیر معاشرہ کا یہ درجہ وجود میں نہیں آسکتا۔ بعض دوسرے عناصر ہر درجے میں ایسے ہیں حسن و خوبی اور کمال کی کمی رہتی ہے! انسان معاشرہ کی ہر دوسری منزل تک اسی صورت میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ جب کہ معاشرہ میں پہلی منزل کے ارکان پائے جاتے ہوں۔ پہلے درجہ میں حسن و خوبی پیدا کرنے والے عناصر دوسری منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی معرض وجود میں آسکتے ہیں بلکہ معاشرہ کے ہر اگلے درجہ میں پہنچ کر انسان پہلے درجہ کے عناصر میں حسن و خوبی اور کمال و لطافت پیدا کرنے پر زیادہ قادر ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ان چاروں درجوں کی تشریح کرتے ہوئے یہ بتائیں گے کہ ان کے کیا کیا ارکان ہیں اور ہر درجہ اپنے ارکان کے پورا ہونے کے بعد کیوں دوسرے درجہ کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

۱۔ معاشرہ کی پہلی منزل

اس درجہ کو جماعتی زندگی اور معاشرہ انسانی کا سنگ بنیاد کہنا چاہیئے۔ اس کے اجتماعی امور سے انسانوں کا چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ کوئی انسانی گروہ دیہات اور شہروں سے کتنی ہی دور کیوں نہ رہے۔ چاہے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہو یا لق و دق صحراؤں یا کسی برِّ اعظم کے آخری سرے پر آباد ہو۔ اس میں اس پہلے درجے کے اجتماعی ادارے ضرور پائے جائیں گے۔ اس مرتبہ میں انسان کو مندرجہ ذیل اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان اشیاء کو حاصل کرنے اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انسان جو جدوجہد کرتا ہے وہ اس ابتدائی معاشرہ کے ارکان ہیں۔

ادائے مافی الضمیر کے لیے زبان کا استعمال معاشرہ کے وجود کے لیے ایک سبب بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی۔ یہ انسانی معاشرے پر اپنا اثر بھی ڈالتی ہے

اور اس سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ تبادلۂ خیالات کی خواہش زبان کی تخلیق کا محرک بنتی ہے اور ہم زبان لوگوں کے باہمی تعلقات ہی معاشرہ کی تشکیل کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ اگر کسی گروہ میں ادائے مافی الضمیر کے لیے کوئی زبان نہ ہو تو وہ کسی کام اور فعل کو اجتماعی طور سے انجام نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ خود زبان لوگوں کے ملنے جلنے سے بنتی ہے اور ان کے باہمی میل جول ہی سے وہ ارتقائی مدارج طے کرتی ہے۔ اس ابتدائی مرتبہ میں شاہ صاحب ادائے مافی الضمیر کے لیے جس زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ ترقی یافتہ زبان نہیں بلکہ زبان کی بالکل ابتدائی شکل جس کا اچھی طرح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس کا ان طریقوں سے مقابلہ کرنا ہے جو حیوانات اپنے ادائے مافی الضمیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ادائے مافی الضمیر کے سلسلہ میں انسان اور حیوانات میں دو فرق ہیں۔ اول تو حیوانات صرف اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ذہنی صورتیں اور ذہنی خیالات نہ تو ان کے یہاں انسان کی طرح پائے جاتے ہیں۔ اور اگر ابتدائی شکل میں یہ صورتیں اور خیالات ان کے ذہن میں آتے بھی ہیں تو وہ اُن کا اظہار نہیں کر سکتے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ حیوانات اپنے جذبات کا ان آوازوں کے ذریعہ اظہار کرتے ہیں، جو طبعی طور پر ان کے جذبات سے مناسبت رکھتی ہیں۔ حیوانات اپنی گھبراہٹ، پریشانی اور غصہ کی حالت میں مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں یہ آوازیں ان کی قلبی کیفیات سے طبعی طور پر مناسبت رکھتی ہیں۔ انسان اپنی قلبی کیفیات کے اظہار کے علاوہ ان ذہنی صورتوں کو بھی ظاہر کرتا ہے جو اس کے ذہن میں سماعت یا بصارت کے راستہ سے پہنچتی ہیں۔ جو صورتیں

ذہن میں سننے کے ذریعہ پہنچتی ہیں، ان کو ان آوازوں ہی کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے جو سے یہ صورتیں ذہن میں منتقل ہوئی تھیں۔ اور جو صورتیں آنکھوں کے راستہ تک ذہن میں پہنچتی ہیں ان کے لیے انسانی ذہن مناسب اور موزوں آوازیں ایجاد کرتا ہے۔ انسان سہولت کے لیے اپنی وہ آوازیں جنہیں صور ذہنی کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے؛ الفاظ کی شکل دے کر علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے نوعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر زمانہ اور ہر مقام کے انسانی گروہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے ایک قسم کی ایک نہ ایک زبان رکھتے ہیں۔

لباس و مسکن

انسان کو سردی گرمی سے بچنے کے لئے ایک مکان کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی محفوظ مقام میں اس لیے بھی رہنا چاہتا ہے کہ خوفناک جانور اور حملہ آور دشمن رات کے وقت اس کا نشان نہ پا سکیں۔ اسی طرح اسے لباس کی ضرورت ہے جو اسے سردی گرمی سے بچا سکے اور جانوروں کے بال اور پروں کی طرح زینت کا بھی کام دے۔ انسان اس ضرورت کو ابتدا میں جانوروں کی کھال یا درختوں کے پتوں سے پوری کرتا ہے لیکن بعد میں زمانہ اسے نہایت خوشنما اور آرام دہ لباس سے واقف کرا دیتا ہے۔

غذا اور اس کے متعلقات

انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہے، اس نے ایسے غلے دریافت کیے جنہیں کھا کر وہ اپنی زندگی گزار سکے۔ اس دریافت شدہ غلہ کو پکانے

کے طریقے دریافت کیے گئے اور یہ معلوم کیا گیا کہ اس کی کاشت کس طرح کی جا سکتی ہے۔ غلہ کی کاشت میں جن اشیا کی ضرورت تھی انہیں ایجاد کیا گیا۔ انسان نے جانوروں کی تسخیر کی اور ایک طرف ان کے دودھ سے فائدہ اٹھانا سیکھا اور دوسری طرف انہیں باربرداری کے لیے استعمال کر کے وہ ان سے اپنی کھیتی باڑی میں مدد لینے لگا۔ اس سلسلہ میں اس نے ایسے طریقے بھی معلوم کئے جن کے ذریعہ پانی اور دوسری چیزیں اپنے استعمال کی جگہ لائی جا سکیں۔ کھانا پکانے اور کھانے کے لیے برتنوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے انسان نے ابتدا ہی سے برتن بنانے کے طریقے دریافت کرنا شروع کر دیئے۔ یہ ضرور ہے کہ اول اول وہ جس قسم کے برتن استعمال کرتا تھا ان کے بنانے کے لیے زیادہ مہارت کی ضرورت نہ تھی۔ انسان نے پہلی دفعہ برتنوں کی جگہ شاید پتوں وغیرہ کا استعمال کیا ہوگا۔ لیکن بعد میں اس کے لئے پتوں سے زیادہ پائدار چیزیں دریافت ہوتی گئیں۔

اخلاقی ضروریات

پہلے درجہ کی اجتماعی زندگی کے لیے مندرجہ بالا چیزوں کے علاوہ انسان کو بعض ایسی اشیاء کی بھی ضرورت تھی جو اس کی اخلاقی ضروریات کو تسکین دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی گروہ میں اخلاقی نظام کی بقا کے لیے ایک آدھ صاحب الرائے بلند حوصلہ، قوی دل سرداربنتا تھا جو ایک مسلمہ قانون کے ذریعہ اپنے گروہ میں امن و امان قائم رکھتا۔ کمزوروں کو ظالموں کے ظلم سے محفوظ رکھنا اس کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ ہر گروہ میں مختلف قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ سردار ان میں توازن رکھتا۔ اس شدید اخلاقی ضرورت کو پیدا کرنے کے لیے اس پہلے درجہ کے معاشرہ

میں یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت بن جاتی ہے کہ ہر مرد کے لیے کسی خاص رسم کے ذریعہ ایک عورت مخصوص کر دی جائے، جس میں کوئی دوسرا مزاحمت نہ کر سکے۔ اس عورت سے فطری خواہشات پورا کرنے اور نسل جاری رکھنے کا صرف ایک ہی مرد کو حق حاصل ہو۔ اس طرح معاشرہ میں خاندانی زندگی کے جراثیم پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ جو بعد کے معاشرتی مدارج میں ترقی کر کے تمدن و معاشرت کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔

معاشرہ کی دوسری منزل

انسان اپنی بنیادی خواہشات پُورا کرنے کے لیے فطری طور مجبور ہے۔ وہ کھانا پکانے، بات چیت کرنے اور جنسی خواہشات پورا کرنے کی ضروریات معاشرہ کے پہلے درجہ میں بھی پورا کرتا ہے۔ لیکن ابتدائی شکل میں وہ اس درجہ پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہشات کو پُورا کرنے کے لیے اچھے سے اچھے طریقوں کی تلاش جاری رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں اس کے فطری اور تجرباتی علوم اور اخلاقی نظریے برابر ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ ارتقاء کے کافی منازل طے کر چکتے ہیں تو پھر سوسائٹی میں ایک دوسرا درجہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب انسان ان لوگوں کے کہنے پر عمل کرتا ہے جو اسے دانش کی اور مذاقِ لطیف کے مطابق خواہشات پورا کرنے کے طریقے بتاتے ہیں۔ معاشرہ کے ان رہنماؤں کو دانش کی اور مذاقِ لطیف کے مطابق طریقے معلوم کرنے میں ان علوم سے بہت مدد ملتی ہے۔ جنہیں وہ اب تک محض اس لیے حاصل کرتے رہتے تھے کہ ان کی فطرت میں علم حاصل کرنے کا شوق ودیعت کیا گیا ہے۔ تمام افرادِ اجتماع ان رہنماؤں کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن یہ سب اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب انسان کی بنیادی خواہشات کو ابتدائی شکل میں پورا ہونے کا موقع مل رہا ہو۔ اگر انسانوں کے کسی اجتماع کو کھانے پینے ہی کو نہ ملے اور ایسے حفظ نفس اور بقائے نسل کے مواقع ہی حاصل نہ ہوں تو اس وقت اس کو نہ مذاق لطیف پر عمل کرنے کی سوجھتی ہے اور نہ رائے کلی پر۔ اس لیے ارتقائے معاشرہ کے دوسرے درجہ کا سوال ہی پیش نہیں آتا۔

معاشرہ کی دوسری منزل میں انسان اس وقت پہنچتا ہے جب کہ انسانی خواہشات کو پورا کرنے کے تمام طریقے اخلاقِ عالیہ کی کسوٹی پر پرکھ لیے جاتے ہیں۔ اور علوم اجتماعی کے اصول پر انہیں جانچ لیا جاتا ہے۔ اس جانچ پڑتال کے بعد ان طریقوں میں سے بعض پسندیدہ طریقے تو محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ سب ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے جو طریقے باقی رہ جاتے ہیں۔ اُن میں مختلف علوم و فنون کی پشت پناہی کی وجہ سے ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ وہ علوم و فنون جو معاشرہ کے دوسرے درجہ کو ترقی کے راستہ پر لے جاتے ہیں، شاہ صاحب نے ان کی تعداد پانچ بیان کی ہے لیکن ہم اختصار کے لیے ان کا تین فنون کے ذیل میں ذکر کرتے ہیں بقیہ دو فن بھی ان ہی تینوں کے ماتحت آ جاتے ہیں، ان تین فنون کو فن آداب معاش، فن تدبیر منزل اور فن اقتصادیات کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

فن آداب معاش

یہ فن انسان کو کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے، پہننے، اوڑھنے اور چلنے پھرنے کے متعلق ایسے طریقے بتاتا ہے جو مذاق لطیف اور رائے کلی کے مطابق ہوں۔ اس کے ذریعے انسان اپنے معیارِ لطافت اور ذہنی تصورات کے مطابق کھانے

پینے، رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے آداب اختیار کرتا ہے۔ اپنے لباس، مسکن اور کھانے پینے کی چیزوں میں شائستگی اور زینت کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہ سب باتیں خوش حالی کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مرفہ الحالی اور خوش حالی اس لحاظ سے اچھی چیز ہے کہ اس سے اخلاق میں راستی اور مزاج میں درستی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مرفہ الحالی اور خوش حالی کے چکر میں پھنس کر انسانیت فتنہ و فساد اور باہمی کش مکش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ فن آداب معاش ہمیں اس حد تک مرفہ الحالی کے طریقوں پر عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ باہمی تنازعات اور کش مکش کی شکل میں نہ نکلے۔

یہ فن لوگوں کو بتاتا ہے کہ ان کے کھانے پینے کی اشیاء میں لطافت کا کیا معیار ہونا چاہیئے۔ انہیں کس طرح پکایا جائے اور پھر کس طرح صاف برتنوں میں رکھ کر کھانے کی میز پر دیا جائے۔ یہ فن لباس اور مکان کے بارے میں بھی لوگوں کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ لباس کے لیے بدن کے کس کس حصہ کو ڈھکنا ضروری ہے۔ اس فن کی رُو سے ہمارے رہنے کے مکان میں سردی گرمی سے بچنے کا پورا سامان موجود ہونا چاہیئے۔ مکان ایسے نہج پر بنایا جائے کہ انسان کی صحت کے لیے جس قدر تازہ ہوا کی ضرورت ہے اس کے رہنے والوں کو آسانی سے ملتی رہے۔ اس میں دھوپ کا بھی کافی گزر ہونا چاہیئے۔ اس کا ایسی جگہ ہونا بھی ضروری ہے۔ جہاں چور اور ڈاکو آسانی کے ساتھ نہ پہنچ سکیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس فن کے ماتحت کھانے پینے سونے جاگنے اور لوگوں سے ملنے جلنے کے آداب بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سب باتیں انسان نے بہت دن تک تجربہ کرنے کے بعد سیکھی ہیں۔ اور وہ ان باتوں پر عمل کر کے اپنے معاشرہ کو ارتقاء کی دوسری

منزل تک لے آتا ہے۔

فنِ تدبیرِ منزل

اس فن کے ذریعہ انسان اپنے اور گھر والوں کے تعلقات میں اصولِ اخلاق، مذاقِ لطیف اور رائے کلی کا لحاظ رکھتا ہے۔ عورت اور مرد کا رابطہ اس منزل کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہ فن بتاتا ہے کہ فطرت نے عورت میں مرد کے لیے کشش و رغبت رکھی ہے۔ نسل کی حفاظت اور باہمی کش مکش کے خاتمہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر عورت صرف ایک مرد سے ربط و تعلق رکھے۔ عورت طبعی طور پر تربیت اولاد سے زیادہ واقف ہے۔ نزاکت، شرم و حیا، گھر میں رہنے کا فطری تقاضا، چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کا دل لگنا عورت کے خصوصی اوصاف ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مرد عمل میں تیز اور جفاکش ہوتا ہے۔ فطرت نے ان دونوں کی طبیعتوں میں مختلف خصائص رکھ کر انہیں ضروریاتِ زندگی میں ایک دوسرے کا دست نگر بنا دیا ہے۔ فنِ تدبیرِ منزل ہمیں بتاتا ہے کہ انسانوں کے ہر اجتماع کو فطرت کے ان تقاضوں کو اپنا رہنما بنانا چاہیئے۔ عورت و مرد آپس میں شوہر اور بیوی کے تعلقات صرف اس وقت خوش گوار طریقہ پر نبھا سکتے ہیں۔ جب کہ وہ ایک دوسرے کے نفع نقصان اور دُکھ سکھ میں اپنے کو پوری طرح شریک سمجھیں۔ پھر اس کے علاوہ انسانوں کو خاندانی واقعات سے جو تجربات ہوتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ گھر کی زندگی کو مطمئن طریقہ پر بسر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ افرادِ خاندان میں مساوات کے گہرے احساس کے ساتھ فرقِ مراتب کا احترام بھی پوری طرح موجود رہے۔ اس کے بغیر انسانوں کے باہمی تعلقات خوش گوار نہیں رہ سکتے۔ شاہ

صاحب فرماتے ہیں:

فنِ تدبیرِ منزل کی رہنمائی میں ہماری خاندانی فضا بہت سی مفید رسوم کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ اور ان رسوم کی پابندی معاشرہ کو ترقی کے راستہ پر لے جانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

فنِ اقتصادیات

فنِ آدابِ معاش اور فنِ تدبیرِ منزل کے ذریعہ زندگی کے نقشہ میں رنگ بھرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ کی پہلی منزل میں انسان جو طریقے استعمال کر کے ضروریاتِ زندگی حاصل کرتا تھا، ان میں ایک بنیادی تبدیلی ہو جائے۔ اس تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ معاشرہ کے دوسرے درجہ میں جو علوم انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اسے مرفہ الحالی کی زندگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر ہر انسان کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے ہر طریقہ میں مذاقِ لطیف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس منزل میں انسان چاہتا ہے کہ وہ اچھے مکان میں رہے، اچھا کھائے اور اچھا پہنے۔ اس کے استعمال کی تمام چیزیں نفاست اور عمدگی کے معیار پر پوری طرح اترنا چاہیئے۔ مزید برآں معاشرہ کے اس درجہ میں انسانی ضرورتیں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں، اس لیے اب افرادِ معاشرہ میں سے ہر ایک کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تمام چیزیں خود تیار کرے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک انسانی ضرورت کی بعض اشیاء کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر شخص اپنے خاص کام میں مہارت حاصل کر سکتا ہے اور ہر چیز میں خوبی اور اچھائی کے معیار کو باقی رکھنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔

پیدائش دولت کے طریقہ کی اس تبدیلی کی وجہ سے اب معاشرہ میں ہر فرد کا پیشہ ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ بعض افراد کھیتی باڑی اور مویشی کی پرورش میں لگ جاتے ہیں اور بعض دوسرے جنگلات اور سمندروں سے عام ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ سوسائٹی کے بہت سے افراد مذکورہ بالا کام کرنے والوں کے اوزار وغیرہ بنانے میں اُن کی مدد کرتے ہیں۔ پھر بہت سے لوگ کپڑا بننے اور مکان بنانے کے کام میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ افرادِ معاشرہ ان کی اس مہارت سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح انسانیت کے علم و تجربہ میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے۔ پیشوں کا تنوع بھی برابر بڑھتا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ تمام پیشے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئے ہیں اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کسی خاص پیشے کو اختیار کرنا باعث عزت ہے اور کسی دوسرے پیشے کو اختیار کرنا بُرا ہے۔ انسان محض اپنی صلاحیتوں اور اپنے ماحول کے اثرات کے ماتحت ایک دوسرے سے مختلف پیشے اختیار کرتا ہے۔ ایک کمزور آدمی فوجی معاملات ہرگز اپنے ذمہ نہیں لے سکتا جس شخص میں تجارت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے وہ بیچارہ کیا خاک تجارت کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ماحول میں کسی خاص پیشہ کی ضروریات مہیا نہیں کر سکتا یا اس ماحول میں رہ کر اس کے امکان سے باہر ہے کہ وہ اس پیشہ کے سکھانے والے اساتذہ کی خدمات حاصل کر سکے تو آپ اس سے کیسے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس خاص پیشہ کو اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ذریعہ بنائے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ پیشوں کے اس تنوع نے بعد معاشرہ میں

ایک اور نئی صورت کا پیدا ہونا لازمی ہو جاتا ہے۔ ہر شخص انسانی ضرورت کی ایک چیز تیار کرتا ہے۔ لیکن اسے زندہ رہنے کے لیے اور بہت سی اشیا کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں اپنی ضرورت پورا کرنے کا آسان طریقہ اسے یہی نظر آئے گا کہ وہ اپنی تیار کردہ اشیاء سے ضرورت کی چیزیں تبدیل کرلے۔ ابتداء میں لوگ ایسا ہی کرتے رہے۔ کسان گیہوں یا دوسرا غلہ دے کر جولاہے سے کپڑا، تیلی سے تیل اور دوسرے پیشہ والوں سے دوسری ضرورت کی اشیاء تبدیل کرتا رہا۔ لیکن یہ طریقہ زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ اس میں طرفین کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس لیے ہر ضرورت مند کو اپنی ضرورت پورا کرنے کے لیے ایک ایسے آدمی کی تلاش کرنا پڑتی تھی جسے اس کی فراہم کردہ اشیاء کی ضرورت ہو۔ اور وہ اس کے بدلے میں ایسی چیز دے سکتا ہو جس کی اسے ضرورت ہے۔ بعض دفعہ لوگوں کو اپنی ضرورت کی چیز حاصل کرنے کے لیے میلوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہو گا۔ اس لیے معاشرہ کے افراد کو ضرورت تھی کہ وہ اس دشواری کا حل تلاش کریں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے لوگوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ معدنی اشیاء کو ذریعہ مبادلہ بنایا جائے۔ ہر شخص اپنے پاس معدنی اشیاء رکھے۔ اور جب اسے کسی شے کی ضرورت ہو، ان معدنی چیزوں کے بدلے میں خرید لیا کرے۔ معدنی اشیا اس کام کے لیے بہت موزوں تھیں۔ اس لیے کہ ان کی ضخامت کم ہے۔ ان کے لاتے لے جانے میں آسانی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں دیرپا ہوتی ہیں اور خراب نہیں ہوتیں۔ پھر معدنی اشیا میں سے ہر شے کی تمام قسموں میں باہم مماثلت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ سونے کے تمام ٹکڑے آپس میں ایک جیسے ہوتے ہیں، ان میں فرق صرف وزن

کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ذریعہ مبادلہ کے ملتے ہی معاشرہ میں ایک اور پیشہ مقبول ہو گیا۔ تجارت اور اشیاء کا مبادلہ ایک مستقل کام بن گیا۔ تاجر لوگوں کو ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے میں مدد دینے لگے۔

اس طرح معاشرہ کے دوسرے درجہ میں انسانی ضروریات بہت بڑھ گئیں اور انہیں پورا کرنے کے طریقے یکسر بدل گئے۔ ان تبدیل شدہ حالات میں لوگوں نے اپنے تجربات کے لیے نئے میدان تلاش کرنا شروع کر دیئے۔ پہلے ہر شخص جدا جدا ایک پیشہ کرتا تھا لیکن اب بہت سے آدمیوں نے مل کر کام کرنا شروع کر دیئے۔ کسی تجارت کے کام میں کئی آدمی شریک ہو گئے۔ یا کسی چھوٹے سے کارخانہ میں کئی آدمی مل کر کام کرنے لگے۔ امداد باہمی کی ان صورتوں کے دریافت ہونے سے معاشرہ کی ترقی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

پیشوں کے تنوع، تجارت کی اہمیت اور امداد باہمی کی مقبولیت کی وجہ سے اب معاشرہ کا کوئی فرد دوسرے افراد سے بے تعلق رہ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کی ضرورتیں پورا ہونے کے لیے اب یہ لازمی ہے کہ معاشرہ کے دوسرے افراد معمول کے مطابق کام میں مصروف رہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ معاشرہ میں امن و امان قائم رہے۔ اس کے دائرہ میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آئے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معاشرہ میں سیاسی نظام قائم ہوتا ہے۔ معاشرہ کے پہلے اور دوسرے درجہ میں بھی کسی نہ کسی حد تک تنظیم ہوتی ہے لیکن اس درجہ کے آخر میں مضبوط قسم کا جو سیاسی نظام وجود میں آتا ہے۔ وہ انسانیت کے کارواں کو معاشرہ کی تیسری منزل میں داخل کر دیتا ہے۔

۳۔ معاشرہ کی تیسری منزل

شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ کے ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک تنظیم ضرور ہوتی ہے۔ لیکن جب معاشرہ کے افراد ایک ایسی منزل میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں ان میں سے ہر شخص کا پیشہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور انہیں باہمی تعاون اور امداد کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو ایک مضبوط سیاسی تنظیم کی ضرورت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس منزل میں مختلف انسانی جماعتوں مثلاً کاشتکاروں، تاجروں، پارچہ بافوں، آہنگروں اور دوسرے گروہوں کے درمیان باہمی ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک سیاسی نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نظام ان کے اجتماعی مفاد کی حفاظت کرتا ہے اور انہیں ایسی خرابیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو ان کے جماعتی نظم و نسق کے لیے بڑا بھاری خطرہ ہوتی ہیں۔ اگر یہ خرابیاں ان کے جماعتی کاموں میں گھر کر جائیں تو پھر افرادِ معاشرہ پُرامن طریقہ سے زندگی بسر نہیں کر سکتے اور ان کے لیے اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس اجتماعی نظام کو تندرست رکھنے کے لیے ایک بالادست قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف قوتوں میں توازن قائم رکھے۔ اس قوت کو شاہ صاحب امامت کے منصب تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس قوت کا مالک صرف شخص واحد ہو۔ بعض دفعہ یہ قوت بہت سے افراد کے ہاتھ میں آسکتی ہے۔ یہ قوت چاہے ایک شخص کے پاس ہو یا ایک سے زائد افراد کے پاس، البتہ معاشرہ کے دوسرے درجہ میں اجتماعی اداروں کی تکمیل کے لیے جن ارکان کی ضرورت ہے۔ جب وہ پوری طرح وجود

میں آ جاتے ہیں تو اس کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ جب یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے تو معاشرہ تیسری منزل میں قدم رکھ لیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب "بدورِ بازغہ" میں معاشرہ انسانی کے اس تیسرے درجہ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سیاسی نظام کو معاشرہ انسانی کو تندرست رکھنے کے لیے پانچ کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی وہ پانچ کام ہیں جن کی وجہ سے ہر معاشرہ میں سیاسی نظام کی ضرورت پیش آتی ہے:

۱۔ اس سیاسی نظام کی ضرورت اوّل تو اس لیے پیش آتی ہے کہ حرص، بخل اور حسد جیسے ناپاک جذبات کی وجہ سے افرادِ معاشرہ میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ان اختلافات کو دُور نہ کیا جائے تو آپس میں قتل و غارت کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور معاشرہ فتنہ و فساد کے گرداب میں پھنس کر تباہی اور بربادی کے سمندر میں ڈوبنے لگتا ہے۔ اس لیے معاشرہ کے سیاسی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرے۔ اس میں اتنی طاقت ہونی چاہیئے کہ وہ ان کے اختلافات ختم کر سکے۔

۲۔ معاشرہ کے بعض افراد بُری عادات اور ناپاک اخلاق میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ان میں انسان کے نوعی تقاضوں کو سمجھنے اور ان پر صحیح طریقہ سے عمل کرنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اس پر حیوانی جذبات اور بُرے اعمال کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ سیاسی نظام کا اس وقت یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے ناپاک ارادوں سے باز رکھے ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی ... کہیں معاشرہ کسی مہلک مرض کا شکار نہ ہو جائے۔

۳۔ بعض افرادِ معاشرہ اجتماعی نظام کو تباہ و برباد کرنے کے درپے رہتے ہیں

وہ اس طریقہ کے ذریعہ یا تو دوسرے لوگوں کا مال و دولت چھیننا چاہتے ہیں
یا ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک گیری کے ذریعہ اپنے ناجائز حوصلوں
کی آگ کو بجھائیں۔ اس قسم کے شر پسند لوگ اپنے گرد بہت سے جنگ جو
قسم کے لوگ جمع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو شر انگیزی سے انسانی
اجتماع کو محفوظ رکھنے کے لیے سیاسی نظام کو اس بات کی ضرورت پڑتی
ہے کہ وہ ان لوگوں سے جہاد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔

۴۔ انسانی اجتماع کو بہترین شکل میں قائم کرنے کے لیے مفکرین امت کے سامنے
ہر زمانہ میں ایک نصب العین رہتا ہے۔ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان
کا معاشرہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ وہ
یہ چاہتے ہیں کہ ان کے معاشرہ میں عدالت اپنے کمال کے ساتھ موجود ہو۔
سیاسی نظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے
کے لیے جدوجہد کرتا رہے۔

۵۔ دنیا کے جھگڑوں میں پھنس جانے کے بعد انسان اپنے اخلاقی اور مذہبی تقاضوں
کو بھول جاتا ہے۔ صحیح دین اور ملت کی ضرورتیں اور ان کے فرائض اس
کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ سیاسی نظام کا یہ بھی فرض ہے کہ رشد
و ہدایت کے ذریعہ انسان کو اس غفلت پر متنبہ کرتا رہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے "بدور بازغہ" اور "حجۃ اللہ البالغہ" کے جن حصوں
میں ریاست اور اقتصادیات کے مباحث سے بحث کی ہے، ان کا بغور مطالعہ
کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے سیاسی نظام کے مندرجہ بالا
جو پانچ مقاصد و فرائض بیان کیے ہیں۔ ان میں بہت لچک ہے۔ ابتدا میں
سیاسی نظام مذکورہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انسان کی زندگی کے

بہت محدود پہلوؤں کی نگہداشت کرتا ہے۔ لیکن انسان کے علم و تجربہ میں وسعت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام کے ان فرائض کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے یہاں ایک ایسے سیاسی نظام کی جھلک اچھی طرح ملتی ہے۔ جو منصوبہ بندی کے ذریعہ افرادِ معاشرہ کے لیے ان کے پیشوں اور ... کا تعین کرے۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں انسانی معاشرہ کا نظام سیاسی ان ... کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن آج ہم دنیا کے علوم اور تجربات کی مدد سے ایسا ... نے پر بخوبی قادر ہیں۔

۴۔ معاشرہ کی چوتھی منزل

ہر آبادی میں ایک مستحکم سیاسی نظام قائم ہو جانے کے بعد انسانیت کی تمام ضرورتیں پوری نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر اس کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر آبادی کا سیاسی نظام ایک مستقل وحدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے افرادِ معاشرہ کے باہمی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور انہیں اپنے سیاسی نظام سے جذباتی طور پر وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب مختلف سیاسی وحدتیں باہم دست و گریباں رہتی ہیں۔ ان کے باہمی تنازعات کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی سیاسی نظام پر حاوی شخصیتیں جوعِ ارض اور ہوسِ اقتدار کے چکر میں قریب کے اجتماع پر حملہ کر دیتی ہیں اور کبھی ایک اجتماع کی معاشی ضرورتیں سیاسی اقتدار کو مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ ایک مضبوط فوجی نظام کے بل پر ملک گیری کی تانیں اڑانا شروع کر دے۔ روزمرہ کے لڑائی جھگڑوں کو ختم کرنے اور بنی نوعِ انسان کو پُرامن فضا میں سانس لینے کا موقع دینے کے لیے معاشرہ کو ایک چوتھی منزل میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ یہاں پہنچ

کہ مختلف چھوٹے معاشرے ایک بڑی سیاسی تنظیم میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ یہ سیاسی تنظیم اتنی طاقت و قوت کی مالک ہوتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کم درجہ کی سیاسی وحدتیں باہم دست و گریباں ہونے کی جرأت نہیں کرتیں۔ اس طرح دنیا امن و سلامتی کی فضا میں ترقی کے منازل طے کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔

شاہ صاحب نے تیسرے اور چوتھے درجہ کے سیاسی نظام کے درمیان کوئی خاص حدیں مقرر نہیں فرمائیں۔ وہ معاشرہ کو تیسرے درجہ پر اس منزل میں مانتے ہیں۔ جہاں سیاسی نظام افرادِ معاشرہ کے باہمی نزاعات کا فیصلہ نہ کر سکے۔ لیکن مختلف سیاسی وحدتوں کی باہم رسہ کشی کو دور کرنا اس کے بس سے باہر ہو۔ جب کسی سیاسی نظام میں یہ صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے تو معاشرہ تیسرے درجہ سے ترقی کر کے چوتھی منزل میں قدم رکھ لیتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے درجہ کی مندرجہ بالا تعریف اپنے مفہوم کے اعتبار سے لچک رکھتی ہے۔ دنیا ایک سیاسی وحدت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ جس دن دنیا میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم ہو جائے گا جس کے زیرِ سایہ دنیا کے کسی حصّہ کی مختلف سیاسی وحدتیں آپس میں نہ ٹکرائیں گی تو ہم کہیں گے کہ اس دن انسانیت نے معاشرہ کے چوتھے درجے کی تکمیل کر لی ہے۔ لیکن جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہیں ہوتی کیا ہمیں اس وقت یہ سمجھنا چاہیئے کہ معاشرہ کا چوتھا درجہ بالکل ہی معرضِ وجود میں نہیں آتا۔ مبحث ارتفاقات کی روشنی میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاہ صاحب معاشرہ کے چوتھے درجہ کی تکمیل تو اس وقت ہی مانتے ہیں۔ جب دنیا میں اس قسم کا نظام قائم ہو جائے۔ لیکن اس سے پہلے بھی کسی نہ کسی صورت میں معاشرہ چوتھے درجہ کی خصوصیات

کا حامل ہوتا ہے، دنیا کے ایک بڑے حصہ میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ہر زمانہ میں ایک نہ ایک سیاسی نظام اتنا مستحکم ضرور ہوتا ہے جو مختلف سیاسی وحدتوں کو باہم ٹکرانے نہیں دیتا لیکن دنیا سے نزاع اور اختلافات کے جھمیلوں کو مکمل طور پر ختم کرنا اس نظام کے بس سے باہر ہوتا ہے معاشرہ انسانی کے چوتھے درجہ کی یہ سب سے بڑی کمی ہوتی ہے جسے دور کرنے کے لیے انسانیت برابر جد و جہد میں مصروف رہتی ہے۔

یہ ہیں معاشرہ کی وہ چار منزلیں جن سے شاہ صاحب کی رائے میں انسانیت کو ناگزیر طور پر گزرنا پڑتا ہے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسانوں کا اجتماع ان چار منزلوں میں سے کسی نہ کسی منزل میں ضرور ہوتا ہے! انسانوں کا کوئی اجتماع متمدن بستی سے کتنی دور ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ اس میں معاشرہ کے پہلے درجہ کی خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے۔ اور اگر اس اجتماع میں متوسط درجہ کی صلاحیت کے انسان موجود ہوں گے تو ان کے معاشرہ کا اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھاتے رہنا بھی یقینی امر ہے۔ ایسا ہونا کیوں ضروری ہے؟ شاہ ولی اللہ صاحب اس سوال کا بہت تشفی بخش جواب دیتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے فطری تقاضے اسے معاشرہ کے قیام پر مجبور کرتے ہیں اور یہی تقاضے اسے ترقی کی راہ پر گامزن رکھتے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ کا ارتقاء، انسان کے فطری تقاضوں کا رہین منت ہے۔ اگر کوئی شخص معاشرہ اور اس کے ارتقاء کی تفصیلات کو اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہے۔ تو اسے چاہیئے کہ معاشرہ کے ہر درجہ میں اور اس کی ہر تبدیلی کے پس پردہ انسان کے ان فطری تقاضوں کو دیکھنے کی کوشش کرے۔

معاشرہ کا فساد اور اس کے اسباب

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ معاشرہ موجودہ حالت میں اپنی ساخت اور اپنے اعمال کے اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ اس میں ابھی بہت سے نقائص ہیں۔ معاشرہ میں ان نقائص کا وجود کچھ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ یہ سب اس کی نشوونما اور ارتقاء کے طریقہ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ چونکہ معاشرہ کے مختلف اعضاء کی ترتیب اور ان کا باہمی ربط و تعلق ناقص ہے۔ اس لیے اس زندگی میں انسانوں کی بہت سی جسمانی اور ذہنی قوت ضائع ہو جاتی ہے اور اس نقصان کی وجہ سے معاشرہ کا جسم بہت سی روح شکن بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی معاشرہ کی بیماریوں اور اس کے فساد کی صحیح ماہیت سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔ ان اسباب کا کھوج لگانا تو بہت بڑی بات ہے جن کی بدولت معاشرہ کو بیماری سے دوچار رہنا پڑتا ہے اور جنہیں اگر دور کر دیا جائے۔ تو معاشرہ کی حالت تندرستی اور صحت کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ معاشرہ کی

صحت کا کوئی ایسا معیار موجود نہیں ہے جسے سب تسلیم کرتے ہوں۔ کسی رسم و رواج کو بعض مفکرین معاشرہ کے لیے بیماری قرار دیتے ہیں اور بعض کی نظریں اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھتیں۔ یہ مشکل اکثر اس لیے پیش آتی ہے کہ معاشرہ کے ہر عضو اور اس کے ہر عمل کی اچھائی برائی ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھی جاتی ہے۔ اگر معاشرہ کی مجموعی حیثیت سامنے رکھی جائے اور پھر اس کی بیماریاں معلوم کی جائیں تو یہ مشکل بڑی حد تک آسان ہو جاتی ہے لیکن اس طریقہ پر اس وقت ہی عمل ہو سکتا ہے۔ جب ہم سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ صحیح اور تندرست معاشرہ میں کن خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ وہ معاشرہ جس کے سب وظائف مکمل ہوں، جس کی ہیئت ترکیبی کے کل اجزا کامل ہوں اور جس کے اعمال کمال کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکے ہوں محض ایک نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر معاشرہ کے مقاصد کی وضاحت کر دی جائے تو کامل معاشرہ کے نصب العین کی تصویر میں جان پڑ جاتی ہے یہ نصب العین جس قدر واضح اور حقیقت کے قریب ہوتا ہے، معاشرہ کی بیماریوں، اس کے فساد اور نقائص کی تہہ تک پہنچنا اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اور ان کے اسباب و علل تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔

عمرانی نصب العین اور کامل معاشرہ

عمرانیات انسانی زندگی کے اس لائحہ عمل کو اپنا موضوع بحث بناتی ہے جس کے ذریعہ معاشرہ ارتقا کے ان تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد اس نصب العین تک پہنچ سکتا ہے، جو ایک کامل معاشرہ کا ہے۔ یہ لائحہ عمل

معاشرہ کے ایسے برگزیدہ لوگ بنا سکتے ہیں۔ جو "ملتہ قصوئی" یا کامل معاشرہ کا ایک واضح اور صحیح تصور رکھتے ہوں اور جن میں اس تصور کو سامنے رکھ کر ماحول کی قوتوں کا جائزہ لینے کی صلاحیت موجود ہو۔ یہ حضرات "ملتہ قصوی" یعنی معاشرہ کے مثالی نصب العین اور جس معاشرہ میں انسان زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں اس کی استعدادوں اور ضرورتوں میں صحیح توازن پیدا کر کے معاشرتی ترقی کے لیے ایک مفید اور ہمہ گیر پروگرام تشکیل کرتے ہیں۔

کامل معاشرہ کا تصور قائم کرنے کے لیے معاشرہ کے مقصد سے واقفیت ضروری ہے۔ بعض مفکرین معاشرہ کا مقصد اجتماعی فلاح اور خیر اکبر کو قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ فلاح ہے۔ لیکن یہ سب باتیں مبہم ہیں۔ اور صرف اس وقت ہی قابل قبول ہو سکتی ہیں جب اس کا کوئی معقول فیصلہ ہو جائے کہ اجتماعی فلاح یا زیادہ سے زیادہ تعداد کی زیادہ سے زیادہ فلاح کسے کہتے ہیں۔ اور اس فلاح کا کیا معیار ہے؟ شاہ ولی اللہ صاحب کے اجتماعی مباحث معاملہ کے اس رُخ پر نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ عام طور سے مفکرین اس قسم کے مسائل کو زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز ہو کر دُور از کار قیاس آرائیوں اور تخیل کی مدد سے حل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کی حکمت آفرین طبیعت کا یہ کمال ہے کہ ان کی یہ بحث محض خیالی اور قیاسی نحو پر چلنے نہیں پائی۔ بلکہ انہوں نے معاشرہ کے جن مقاصد پر اپنے نظریات کی شاندار عمارت اٹھائی ہے، وہ اس روز و شب کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی سوتیں خود انسان اور اس کے ماحول سے پھوٹتی ہیں۔ شاہ صاحب نے معاشرہ کے جو مقاصد بیان کیے ہیں، انہیں معلوم کرنے کے لیے خیال آفرینی اور تخیل پرستی

کی بالکل ضرورت پیش نہیں آتی۔ بلکہ دل کی ذرا سی بصیرت اور نظر کی یک گو نہ تربیت انسان پر معاشرہ کے مقاصد اور ان کے تمام سربستہ راز کھول دیتی ہے۔

شاہ صاحب، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، معاشرہ اور اجتماعی زندگی کا منبع و مخزن انسان کے فطری میلانات کو مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک معاشرہ کے مقاصد کا تعین کرنے کے لیے انسان کے فطری تقاضوں کی معرفت ہی دلیلِ راہ بن سکتی ہے۔ معاشرہ چونکہ انسان کے فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے اس لیے اس کا واحد مقصد یہی ہے کہ وہ انسانیت اور افرادِ معاشرہ کے تمام فطری تقاضوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرے۔ ان فطری تقاضوں کی تسکین میں ایک خاص ترتیب ہونا ضروری ہے تاکہ ایک تقاضے کا مظہر دوسرے تقاضوں کے مظاہر کے ساتھ نہ ٹکرا سکے۔ اور اس طرح کل انسانیت کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے اعمال ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں اور ان کے مختلف فطری میلانات کے مظاہر میں اتحادِ عمل کا نام و نشان نہیں ملتا۔ اس طرح بعض افرادِ معاشرہ کے بہت سے تقاضے تشنۂ تسکین رہ جاتے ہیں۔ ان تمام خرابیوں کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرہ میں مختلف قسم کی بیماریاں پھیل جاتی ہیں۔ الغرض شاہ صاحب کے نظریات کی روشنی میں کامل معاشرہ وُہ ہے جس میں ہر فرد کے تمام تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ اور ان تقاضوں کے مظاہر میں پورا اتحادِ عمل موجود رہے۔ یہ سب صرف اس وقت ہی ممکن ہے۔ جب کہ فطری تقاضوں کے انفرادی اور اجتماعی دونوں مظاہر میں عدالت و توازن کارفرما ہے۔ جس معاشرہ میں یہ توازن ہوتا ہے، اس میں انسانیت کی مندرجہ ذیل چار بنیادی خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ پاکیزگی، خشوع و

خضوع، ضبطِ نفس اور عدالت۔ ان بنیادی اخلاق کی وضاحت کے لیے خود شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان سنیئے۔ "ہمعات" میں لکھتے ہیں:۔

اس تقریر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلہ میں جو چیز مطلوب ہے، وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کی تبلیغ کے لیے بھیجا تھا۔ تمام ملل حقہ میں انہی چار خصلتوں کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص ہے۔ "بر" یعنی بھلائی انہی چار خصلتوں کا حاصل ہے۔ اور گناہ سے مراد وہ عقائد اور اعمال و اخلاق ہیں۔ جو انہی چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار خصلتوں میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے۔ بلکہ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی روح اور ان کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو اور میل چرک اور بال اس کے بدن پر جمع ہوں اور بول و براز اور ریح نے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض تنگی اور حزن اپنے اندر پائے گا اور جب غسل کرے گا اور زائد بالوں کو دور کرے گا اور نیا لباس زیب تن کرے گا اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح سرور اور انبساط کا احساس ہو گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت یہی وجدانی کیفیت ہے جو انس اور نور سے تعبیر کی جا سکتی ہے (اس وجدانی کیفیت میں جو باتیں خلل انداز ہوتی ہیں ان سے نجات حاصل کرنے کو طہارت کہا جائیگا)

دوسری خصلت خدائے تعالیٰ کے لیے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیاز مندی ہے۔ اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویشوں سے فراغت کے بعد اللہ کی صفات، اس کے جلال اور اس کی کبریائی میں غور کرتا ہے تو اس پر ایک حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیاز مندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آ جاتا ہے اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں وہ کسی اور قوت کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست و پائی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بلند تر کسی اور قوت کو مانے۔ ایک طبیعی نے اسے مادہ سے تعبیر کیا، فلسفی نے اسے عقل کل مانا اور مذہبی اسے خدا کہتا ہے۔ بہر حال انسان کہیں نہ کہیں اس کائنات کے سامنے اپنے آپ کو ضرور مجبور پاتا ہے اور یہی مجبوری اسے خضوع کی طرف لے جاتی ہے)

تیسری خصلت سماحت اور فیاضی ہے (ضبطِ نفس) اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس طلب لذت، حب انتقام، بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس ذیل میں عفت، جدوجہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ تمام آ جاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش قبول نہ کرنے کا نام عفت ہے۔ آسائش اور ترک عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام جدوجہد ہے اور جزع و فزع کو روکنا صبر ہے۔

اور انتقام کی خواہش کو دبا نا عفو اور خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت اور حرص کو قبول نہ کرنا قناعت ہے۔ شریعت کی بنائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔ شاہ صاحب لمعات میں (لمعہ ۱۷) ایک جگہ اور فرماتے ہیں کہ سماحت کے تمام شعبوں کی اصل بنیاد ایک چیز ہے اور وہ یہ کہ بہیمیت اور اس کی تمام شکلوں پر انسان کے نوعی تقاضے (رائے کلی) غالب رہیں۔

چوتھی خصلت عدالت ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے۔ ادب، کفایت، حریت، سیاستِ مدینہ اور حسنِ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا اور عمدہ و بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرچ، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو بخوبی سرانجام دینا حریت ہے۔ اور شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاستِ مدینہ ہے۔ بھائیوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو پہچاننا اور ان سے الفت اور بشاشت سے پیش آنا حسنِ معاشرت ہے۔"

شاہ صاحب کے نزدیک کامل معاشرہ کے افراد میں یہ چاروں اخلاق اپنی مکمل شکل میں موجود ہونا چاہئیں مگر یہ اخلاق صرف اس معاشرہ ہی میں مکمل ہو سکتے ہیں۔ جہاں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق انسان کی معلومات ہمہ گیر ہوں اور جس کے علوم تحقیق کی اعلیٰ منازل تک پہنچ چکے ہوں۔ اس قسم کا معاشرہ صرف اس وقت معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ جب کہ وہ تمام اسباب و علل مہیا ہو چکے ہوں۔ جن کا اس معاشرہ کے وجود سے پہلے پایا جانا ضروری ہے۔ ان اسباب و علل کی تخلیق دنیا کی بہت سی قوموں اور انسانوں کی حاصل کی ہوئی

بے شمار معلومات و علوم کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اس لیے جب تک کسی معاشرہ میں متعلقہ معلومات اور علوم سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ جب تک اس کی نگرانی کرنے والے توانینِ قدرت کی جملہ تفصیلات سے واقف نہ ہوں۔ جب تک اُن کی یہ واقفیت علم اور تجربہ پر مبنی نہ ہو اور جب تک یہ علوم انسانیت کے تمام گردوپیش کو اس طرح احاطہ نہ کر لیں کہ انسانیت، زندگی اور کائنات کا کوئی پہلو ان کی پہنچ سے باہر نہ رہے، اس وقت تک وہ معاشرہ کمال کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

اس کامل معاشرہ کی شاہ صاحب نے "بدورِ بازغہ" میں "ملتِ تصوفی" کے بیان میں بہت سی خصوصیات بیان کی ہیں۔ جن میں سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کامل معاشرہ یا ملتِ تصوفی میں اجتماعی زندگی سے متعلق صرف ایسے اصول بنائے جائیں۔ جن کا تعلق عام انسانیت سے ہو۔ اور جنہیں کسی خاص ماحول اور حالات سے وابستگی نہ ہو۔ ہاں البتہ ان اصولوں میں یہ صلاحیت ہونا ضروری ہے کہ وہ ہر ماحول اور حالات کا ساتھ دے سکیں۔ اس معاشرہ میں ان اصولِ کلیہ کی تفصیلات بھی پوری تحقیق و تفتیش کے ساتھ مرتب ہونا لازمی ہیں! ان تفصیلات کو ایک طرف نہ خاص ماحول اور حالات کے مطابق ہونا چاہیئے اور دوسری طرف ان میں انسانیت کے تمام افراد کی استعدادوں، اُن کے مزاج، عادات اور اخلاق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔ اور یہ صرف اُس وقت ممکن ہے، جب کہ یہ تفصیلات تمام افرادِ معاشرہ کی نفسی کیفیات اور شخصی خصوصیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کی جائیں۔

کامل معاشرہ یا ملتِ تصوفی میں انسانیت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کا سامان مذکورہ بالا نہج ہی پر فراہم کیا جائے گا۔ اس میں مادرلئے دنیا کے معارف

اصول کی شکل میں مقرر کیئے جائیں گے اور پھر ان کو ہر شخص کی استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے بیان کیا جائے گا۔ اس معاشرہ میں ہر استعداد کا آدمی ان معارف سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ ریاضت اور عبادات کا بھی ایسا نظام ہونا ضروری ہے جس میں انسان کی مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کا لحاظ موجود ہو۔ اس کامل معاشرہ میں فتنہ وفساد، جرم و سزا اور برائیوں کی تفتیش اتنے بڑے پیمانہ پر ہونا چاہیئے کہ اس کے ذریعہ جرموں اور برائیوں کے مختلف وجوہ اور اسباب و علل پوری طرح واضح ہو جائیں۔ اس معاشرہ میں لوگوں کو انسانیت کے ممکنہ مصائب اور گزشتہ حالات و واقعات کا بھی علم ہوگا اور وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آئندہ اس معاشرہ میں کیا کیا خوبیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ کامل معاشرہ کے افراد میں یہ صلاحیت بھی ہوگی کہ وہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر یہ معلوم کریں کہ مصائب کو روکنے اور اچھے نتائج پیدا کرنے کے لیے کون سے اسباب و علل کی ضرورت ہے اور انہیں مہیا کرنے کے لیے موجودہ واقعات اور حالات میں کون سے تغیرات پیدا کرنا ضروری ہیں۔ مختصراً یہ کہ کامل معاشرہ اور ملۃ قصوی اس معاشرہ کا نام ہے جس میں انسانیت کے تمام تقاضے باحسن وجوہ پورے ہو جائیں اور معاشرہ کے کسی فرد کا کوئی تقاضا تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔

شاہ صاحب کے نزدیک کامل معاشرہ یا ملۃ قصوی کا یہ تصور کبھی اپنی مکمل شکل میں اس مادی دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہونا عقلاً محال ہے۔ انہوں نے اس کے ناممکن الوجود ہونے کے لیے تین دلائل پیش کیے ہیں۔ اول تو یہ کہ کامل معاشرہ کا نظم و ضبط قائم کرنے والے کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ کسی انسان میں بدرجۂ کمال نہیں پائی جا سکتیں۔ ایسے کامل معاشرہ کا جو شخص نظم و ضبط قائم رکھے، اس کو انسانیت کے اس بلند ترین مقام کا

مالک ہونا چاہیئے جہاں انسان اور قدرت کے درمیان سے تمام پردے اور حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ افرادِ انسانی کا اس درجہ تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ دوسرے نظم و ضبط قائم رکھنے والی ذات سے جو لوگ ضروری علوم نقل کرتے ہیں یا جو معاشرے ان علوم کے ذریعے اپنے افراد کی زندگی کے مسائل حل کرتے ہیں یا پھر وہ حکیم و مفکر جو اس نظم و ضبط قائم رکھنے والی ذات کے مقرر کردہ اصول کے ماتحت معاشرہ کے رسم و رواج کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اُن کے لیے کائنات اور حیاتِ انسانی سے تعلق رکھنے والے تمام علوم سے پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ انسانیت کی مجبوریوں کے پیشِ نظر ایسے افراد کا وجود ناممکن ہے۔ اس لیے کامل معاشرہ کبھی معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا۔ تیسرے ایسے کامل معاشرے کے تمام افراد میں اتنی فہم و فراست کا پایا جانا نہایت لازمی ہے کہ وہ معاشرہ کے فیصلوں اور حکیموں کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں کیونکہ اگر تمام افرادِ معاشرہ اس استعداد اور صلاحیت کے مالک نہ ہوں تو معاشرہ کمال کی منزل تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے! انسانیت کے تمام افراد کے لیے ذکاوت کی منزلِ اعلیٰ تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ ان تین دلائل کے پیشِ نظر شاہ صاحب کے نزدیک کامل معاشرہ کا یہ تصور صرف ایک نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا دُنیا میں پایا جانا ممکن نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر کامل معاشرہ یا "ملتہ قصوی" کا وجود ممکن ہی نہیں ہے تو پھر اس کے تصور سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس سوال کا وضاحت کے ساتھ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ معاشرہ کا کمال کی انتہائی منزل تک پہنچنا محال ہے لیکن وہ اس مکمل تصور کی روشنی میں کمال کے قریب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح معاشرہ

میں ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اگر معاشرہ کے حکمار کامل معاشرہ کے اس تصور کو اپنے سامنے نہ رکھیں تو ارتقائے معاشرہ کے لیے کوئی صحیح لائحہ عمل ترتیب نہیں دے سکتے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں معاشرہ کے مصلحین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ کامل معاشرہ کا کوئی نہ کوئی تصور اپنے سامنے رکھیں۔ اور اس اجمالی تصور کی مدد سے اپنے زمانہ اور حالات کے مطابق ضروری علوم اور معلومات حاصل کرتے رہیں۔ یہ برگزیدہ جماعت ہمیشہ قدرت ایزدی کی توفیق اور اپنے حوصلہ کے مطابق ان علوم اور طرق زندگی میں سے جو کامل معاشرہ کے وجود کے لیے لازمی شرط کا درجہ رکھتے ہیں، کچھ نہ کچھ حصہ حاصل کرتی رہتی ہے۔ کامل معاشرہ کی جو خصوصیات ان کے حالات اور ماحول میں پیدا ہو سکتی ہیں، وہ ان کے وجود میں لانے کے لیے ضروری تدابیر عمل میں لاتی ہے اور جن خصوصیات تک موجودہ ماحول اور حالات میں معاشرہ کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کی کرتی ہے جن کے بعد ان خصوصیات کا پایا جانا بھی آسان ہو جائے اس طرح اس برگزیدہ جماعت کی رہنمائی میں معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا رہتا ہے۔ اور وہ اگرچہ کامل معاشرہ کی منزل تک کبھی نہیں پہنچتا اور نہ پہنچ سکتا ہے لیکن اس کی بہت سی خصوصیات کامل معاشرہ سے مشابہ درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔

معاشرہ کے ارتقاء کا یہ سلسلہ معمول حالات میں برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو معاشرہ کی نشوونما کے لیے سخت مضر ہوتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ افراد کامل معاشرہ کے تصور اور اس کے مقاصد کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور وہ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری وسائل سے کام نہیں لیتے۔

اصل تو انسان کا علم خود محدود ہوتا ہے۔ اور اس پر یہ غفلت۔ غرض اس صورت حالات کی وجہ سے معاشرہ بہت سے مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کا نظم و ضبط اس وقت ایسے فاسد عناصر کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، جو خود مریض ہوتے ہیں اور معاشرہ کے امراض سے انہیں واقفیت تک نہیں ہوتی۔ ان غیر معمولی حالات میں ہر معاشرہ میں اکثر ایسے حکیم اور مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو افرادِ معاشرہ کو ان کی لغزشوں اور جماعتی بیماریوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انہیں فساد کے اسباب اور اسے دُور کرنے کا علاج بتاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکر اکثر اس وقت پیدا ہوئے ہیں جب ان کے معاشرہ کو غیر معمولی حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔

معاشرہ کے امراض کی تشخیص

انسان کی اجتماعی زندگی اس قدر پیچیدہ ہے اور معاشرہ کے مختلف مظاہر آپس میں اس قدر گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ زندگی کے کسی شعبہ کے امراض کی تشخیص اور اس کے لیے مناسب علاج تجویز کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ یہ مشکل اس لیے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ معاشرہ کی بہت سی خرابیاں زندگی کے کئی شعبوں کے فساد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اکثر اوقات ایک ذراسی خرابی بہت سی خرابیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اخلاقی بیماری معاشی عدم توازن کا سبب بنتی ہے اور معاشی عدم توازن اخلاقی امراض کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ سیاست اور حکومت کی معمولی سی لغزش معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اس لیئے معاشرہ کے کسی مرض کے متعلق یہ کہنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے اور اس کا بنیادی سبب زندگی کے کس پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ معاشرہ کے امراض کی تشخیص انسان کے جسمانی امراض کی دریافت سے زیادہ مشکل ہے۔ معاشرہ کے کسی ایک مرض کی وجہ دریافت کرنے کے لیے معاشرہ کے تمام اجتماعی اداروں کی چھان بین کرنا پڑتی ہے اور معاشرہ کی اصلاح کا کام کرنے والے پہلے ان اداروں کا معاشرہ کے ارتقائی منازل، اس کے مقاصد اور کامل معاشرہ کے تصور سے مقابلہ کرتے ہیں اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ معاشرہ کی بیماری کیا ہے اور اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر بیان کی ہوئی باتوں کو سامنے رکھ کر معاشرہ کے مدوجزر اور اس کی ارتقائی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے اس مطالعہ کے نتیجہ کے طور پر انہوں نے امراضِ معاشرہ کی تشخیص کے لیے ایک اصول مرتب کیا ہے۔ اگر معاشرہ کے امراض کی تشخیص اور فسادِ انسانیت کے اسباب معلوم کرتے وقت اس اصول کو دلیلِ راہ بنایا جائے تو مصلحین امت کا کام بہت سہل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فسادِ انسانیت اور معاشرہ کی خرابیوں کے دو بنیادی سبب ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی ہر خرابی کے متعلق اگر یہ معلوم کر لیا جائے کہ وہ ان دو باتوں میں سے کس کا نتیجہ ہے تو مرض کی تشخیص اور اس کا علاج بہت سہل ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک فسادِ معاشرہ کا ایک بنیادی سبب تو یہ ہے کہ لوگ اکثر اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لیے ایسے ذرائع اور طریقے اختیار کرتے ہیں جو ان کی طبیعت سے مناسبت رکھتے ہوں۔ ان میں اطمینان اور فارغ البالی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لوگ اپنی طبیعت اور ماحول سے مناسبت نہ رکھنے والے طریقے یا تو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ غلطی سے انہیں دوسرے طریق ہائے زندگی سے اچھا سمجھتے ہیں یا پھر ان طریقوں کو ان کے آباؤ اجداد نے اختیار کیا تھا اور اب انہیں چھوڑتے ہوئے لوگوں کو تکلیف

ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے بدلے ہوئے حالات اور تبدیل شدہ طبائع کا لحاظ نہیں رکھتے۔ بلکہ لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں اور فرسودہ نظام زندگی کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس قسم کے امراض کی اصلاح کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کے فطری تقاضوں کے لیے اپنے طبائع اور ماحول کو سامنے رکھ کر تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ نوع انسانی کی بنیادی خواہشوں پر نظر رکھنا دفع امراض کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

فسادِ معاشرہ کا دوسرا بنیادی سبب جس پر شاہ صاحب نے بہت زیادہ زور دیا ہے یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ بعض اوقات اپنی دوسرے درجہ کی ضروریات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور انہیں پورا کرنے میں اس حد تک مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ پہلے درجہ کی ابتدائی ضرورتیں پورا کرنے کی طرف سے ان کی توجہات ہٹ جاتی ہیں۔ شاہ صاحب نے اس دوسرے سبب کی "بدور بازغہ" میں تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف ادارے اور اعمال واشغال اس لیے ناقص اور غیر مفید بن جاتے ہیں کہ ان کے اہم ارکان کی طرف توجہ نہیں دی جاتی اور ان کے وجود کے لیے جن اہم امور کی ضرورت ہے ان پر عمل نہیں کیا جاتا یا پھر دوسرے درجہ کے رسم و رواج پر اس طرح زور دیا جانے لگتا ہے کہ پہلے درجہ کے اجتماعی اداروں کی طرف افرادِ معاشرہ کی توجہ قطعاً نہیں رہتی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ معاشرہ کے تیسرے درجہ کی خصوصیات کو زیادہ اہمیت دی جانے لگتی ہے۔ اور لوگ دوسرے درجہ کے اجتماعی اداروں کی تشکیل اور ان کے مقاصد سے پہلوتہی برتنے لگتے ہیں۔ اس غلط روش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اعلیٰ قسم کے اجتماعی ادارے بھی اپنی صحیح اور تندرست شکل میں باقی نہیں رہتے۔ یہ اس لیے کہ اونچے درجہ کے

اجتماعی ادارے ہمیشہ اپنے سے کم درجہ کے معاشرہ کی ترقی یافتہ شکل ہوتے ہیں۔ اگر زیردست ادارے ناقص ہوں تو بلند اداروں کا ناقص ہونا لازمی ہے۔
شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ کی مندرجہ بالا خرابیاں دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بلند درجہ کے اجتماعی اداروں کی تفصیلات کو نظر انداز کر کے اس سے کم درجہ کے اداروں کی تکمیل اور صحت کی طرف توجہ دی جائے۔ اس طرح معاشرہ کا ایک درجہ مکمل ہونے کے بعد خود بخود دوسرا درجہ پیدا ہو جائیگا۔ مثلاً اگر معاشرہ کے چوتھے درجہ یعنی بین الاقوامی نظام میں فساد پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح کی صرف یہ صورت ہے کہ افرادِ معاشرہ تیسرے درجہ کے اجتماعی اداروں کی درستی میں لگ جائیں۔ ان اداروں میں خود ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ ترقی پا کر چوتھے درجہ کا معاشرہ وجود میں لے آئیں۔ اس لیے اس وقت چوتھے درجے کے معاشرہ کی تفصیلات کو نظر انداز کرنا ہی مناسب ہے کیونکہ ان خاص تفصیلات سے جو نظام بنتا ہے اس کی خرابی ہی فسادِ معاشرہ کا باعث ہوتی ہے۔ اور ان تفصیلات میں ترمیم اور ردوبدل کرنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اگر موجودہ تفصیلات پر زور نہ دیا جائے تو انسانیت چوتھے درجہ کے اجتماعی اداروں کی ضرورت خود بخود محسوس کریگی۔ اور عملی تجربات کی منزل سے گزر کر وہ خود اُن کو وجود میں لانے کے لیے جدوجہد شروع کر دے گی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر تیسرے درجہ کے معاشرہ کی بیماریوں کو دُور کرنے کے لیے دوسرے درجہ کے اور دوسرے درجے کے اجتماعی اداروں میں خرابی پیدا ہونے پر اوّل درجے کے اجتماعی اداروں کی طرف توجہ کی جائے تو معاشرہ کی تمام خرابیاں دُور ہو جاتی ہیں۔

امراضِ معاشرہ

مندرجہ بالا اصول کو سامنے رکھ کر شاہ صاحب نے معاشرہ کی جن بیماریوں کا اپنے مباحث میں ذکر کیا ہے، انہیں تین بڑے عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس ذیل میں سب سے پہلے وہ فاسد رسم و رواج آتے ہیں جو انسانیت کے فطری تقاضوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرنے کی قابلیت کھو بیٹھتے ہیں اور جو معاشرہ پر محض بار بن جاتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مرض آتے ہیں جو معاشرہ میں معاشی عدمِ توازن کا نتیجہ ہوتے ہیں اور تیسرے درجہ میں ان جرائم کو شمار کرنا چاہیئے جو معاشرہ کی تنظیم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کا سدِّ باب کرنا معاشرہ اور اس کے قوی مظہر حکومت کا فرض شمار کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم ان تینوں قسم کے امراض پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں تاکہ ان کی صحیح ماہیت اور علاج کے لیے مناسب تجاویز واضح ہو جائیں۔

۱۔ فاسد رسم و رواج

رسم و رواج کی ضرورت پر شاہ صاحب نے بہت زور دیا ہے اور بہ حقیقت ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کا کام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک معاشرہ اور رسومات کا باہمی تعلق اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔ معاشرہ اصل ہے اور حکومت اس کی دوسری منزل۔ معاشرہ میں زندگی گزارنے کی جو عملی صورت ہوتی ہے وہ رسم ہے اور ان رسموں ہی کو حکومت قانون کی شکل دیتی ہے۔ اس طرح قوانین و ضوابط ظہور میں آتے ہیں۔ رسوم کو سمجھے بغیر کوئی نظام قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی تدابیر

اور معاشرہ کے لیے رسومات وہی مرکزی درجہ رکھتی ہیں جو انسان کے جسم میں قلب کو حاصل ہے۔ دنیا کی تمام شرائع کا مقصد ان رسومات ہی کی اصلاح رہا ہے۔ یہ رسم و رواج انسان کی زندگی میں کس طرح تشکیل پاتے ہیں، شاہ صاحب نے اس کی کئی صورتیں اور کئی اسباب بیان کیے ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ یہ رسومات بعض دفعہ مفکرین کے نظامِ فکر کا نتیجہ بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں اور کبھی بعض سلیم الفطرت انسان اپنے فطری الہام اور وجدان کے ذریعہ ان تک پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن زندگی کی کسی شکل صورت کا کسی مفکر کے ذہن میں آ جانا یا کسی سلیم الفطرت انسان کا اسے پا لینا اس بات کی ضمانت کے لیے کافی نہیں ہے کہ جمہور انسانیت اور معاشرہ کے تمام افراد میں اس کو مقبولیت حاصل ہو جائے۔ ان رسومات کو مقبولِ عام بنانے کے لیے اور دوسرے اسباب کام کرتے ہیں۔ مثلاً بعض رسومات لوگوں میں محض اس لیے شرفِ قبولیت حاصل کر لیتی ہیں کہ انہیں حاکمِ وقت اپنا لیتا ہے اور محکوم اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ان رسومات کی پابندی کرنے لگتا ہے۔ بعض مرتبہ کسی رسم کو افرادِ معاشرہ اس لیے اپنا لیتے ہیں کہ وہ اسے اپنے وجدان کے عین مطابق پاتے ہیں اور بعض مرتبہ وہ اس کے اس لیے بھی پابند ہو جاتے ہیں کہ ان کی نظر سے چند ایسے مشاہدات گزر چکے ہوتے ہیں جن میں ان رسومات کی طرف سے غفلت برتنے یا انہیں بالکلیہ چھوڑ دینے کی وجہ سے افرادِ معاشرہ مصائب کا شکار ہو گئے تھے۔ مبصرین ان رسومات کی صحت کا یقین تاریخِ عالم کے حقائق پر غور و خوض کے بعد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے سامنے بہت سے ایسے معاشروں کی تاریخ ہوتی ہے، جن میں سے بعض میں ان رسوم کی طرف سے غفلت برتی گئی تھی۔ اور بعض میں ان کی پابندی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ ان دونوں صورتوں میں جو

مختلف نتیجے برآمد ہوئے تھے وہ ان کے علم ولیقین کا سبب بن جاتے ہیں۔
ان رسوم کا وجود انسانیت کے لیے اس لیے مفید ہوتا ہے کہ معاشرہ کے افراد ان کی وجہ سے زندگی کے صحیح طریقوں پہ چلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ رسومات لوگوں میں مقبول نہ ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اکثر افرادِ معاشرہ جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ہر فرد بشر کو اس بات کا موقع نہیں ملتا، کہ وہ خود اپنی وقتِ نظر سے زندگی کے صحیح طریقے معلوم کر سکے آج بھی دنیا میں ایسے آدمیوں کی بڑی تعداد ہے جو زندگی کے صحیح طریقوں پر عمل کرتے ہیں لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ وہ ان طریقوں کی پابندی کن مصالح کے پیشِ نظر کرتے ہیں تو وہ اس کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ ان کی تمام قوم ان رسوم کی پابند ہے اس لیے وہ بھی ان پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر انہیں ان رسومات کے مصالح کے متعلق کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو محض اجمالی طور پر۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر معاشرہ میں رسومات جاری نہ رہیں تو معاشرہ کے بہت سے افراد چوپایوں ایسی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں گے۔ یہ حقیقت اس وقت تو اور اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جب معاشرہ میں صحیح رسوم کے بجائے غلط اور باطل رسومات رائج ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں انسانوں کا معاشرہ یقینی طور پر بڑی حد تک جانوروں کے گلوں کی خصوصیات کا مالک بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک معاشرہ میں فاسد رسم و رواج کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب معاشرہ کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے جو اپنی تنگ نظری کی بدولت انسانیت کے فطری تقاضوں کو مجموعی طور پر دیکھ نہیں سکتے اور مصالح کلیہ سے آنکھیں بند کر کے صرف جزئی مصلحتوں کو اپنے سامنے

پر کھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افرادِ معاشرہ بہیمانہ افعال میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان میں فاسد رسم و رواج کا ایک جال بچھ جاتا ہے۔ ان فاسد رسومات کی بہت سی صورتیں ہیں۔ شاہ صاحب نے "بدور بازغہ" میں ان کو تین بڑے عنوانات میں تقسیم کیا ہے :

فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ رسومات معاشرہ کے لیے اس لیے باعثِ فساد ہوتی ہیں کہ اُن کی موجودگی میں انسانوں کے اخلاقِ صالحہ کو ترقی پانے کا موقع نہیں ملتا اور اس طرح افرادِ انسانی اپنی مفید صلاحیتوں کو صحیح طور پر اجاگر نہیں کر پاتے۔ مثلاً اگر افرادِ معاشرہ کی طبیعت میں جھگڑا اور فساد رچ جائے اور وہ اپنے کسی معاملہ کو جنگ و جدل کے بغیر طے نہ کر سکیں یا ان میں اپنے امیروں کی اطاعت اور فرماں برداری کا جذبہ غلبہ پا جاتے تو ایسی صورت میں ایک سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ امر بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی سماحت (ضبطِ نفس) اور قیادت کی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے۔ وہ مذکورہ بالا معاشرہ میں امراء کی اطاعت پر مجبور رہتا ہے اور اپنی طرف سے کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ بعض مرتبہ عام افراد کو ایسی سوسائٹی میں بھی اپنے اخلاقِ صالحہ کی ترقی کا موقع نہیں ملتا۔ جہاں اصولی طور پر سماحت اور قیادت کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے تمام ضروری رسومات جاری ہوتی ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب افرادِ معاشرہ کی فطرت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے اور ان کی طبیعتیں گردشِ زمانہ کی بنا پر اس حد تک بگڑ جاتی ہے کہ اگر معاشرہ میں صحیح رسوم جاری کر دی جائیں تو وہ اپنے فطری تقاضے پورے نہیں کر سکتے۔ وہ زندگی کی تگ و دو میں صرف اس وقت ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ جب انہیں بڑے لوگوں کی مکمل رہنمائی حاصل ہو۔ اور وہ ان پر مکمل اعتماد کر کے ہر اچھی بُری بات میں اُن کی اطاعت کریں۔ اپنی طرف سے کوئی اقدام کرنا ان کے لیے ناممکن ہوتا

ہے۔ کسی کی قیادت بھی ان کے لیے صرف ایسی صورت ہی میں قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ وہ ان کے جنگ و جدل اور متعصبانہ جذبات کو اپیل کرے۔

دوسری قسم فاسد رسومات کی وہ ہے جو اخلاقِ صالحہ اور اجتماعی اداروں کی صحیح ضروریات کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً جس معاشرہ میں دوسرے کا مال غصب کرنا، ڈاکہ زنی اور چوری افراد کا پیشہ بن جائیں۔ جس معاشرہ کے اراکین شہوانیت اور بہیمیت سے مغلوب ہو کر ایسے طریقے اختیار کر لیں جو انسان کی فطرت کے خلاف ہیں۔ ان میں زنا اور لواطت جیسے افعالِ شنیعہ کا عام رواج ہو جائے۔ مرد عورتوں کی صفات اختیار کرنے لگیں۔ اور عورتیں مردوں کی، یا پھر وہ آرام طلبی، آسائش اور تعیش کے چکر میں پڑ کر معاشی نظام سے بے پروا ہو جائیں۔ ان میں لہو و لعب، شطرنج بازی، شکار اور کبوتر بازی جیسے مشاغل کا رواج عام ہو جائے۔ اور عوام بھاری بھاری ٹیکسوں کے نیچے دب جائیں تو اس معاشرہ کا نظم و ضبط میں خلل پڑ جاتا ہے۔

تیسری قسم فاسد رسم و رواج کی وہ ہے جس کی وجہ سے خالقِ کائنات کی طرف سے بے رخی عام ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے پیٹ اور آرام و آسائش کے دھندوں میں ایسے پھنس جائیں کہ انہیں مادی دنیا سے نکلنے کی فرصت نہ رہے اور وہ کبھی خالقِ کائنات کا تصور تک نہ کریں۔ ایسی صورت میں افرادِ معاشرہ اپنے اخلاقی اور روحانی تقاضوں کی طرف سے بے توجہی برتنے لگتے ہیں۔ اپنے فطری تقاضوں سے بیگانگی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی زندگی بے اطمینانی، یاس اور قنوطیت کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

جس معاشرہ میں اوپر بیان کی ہوئی فاسد رسمیں پائی جائیں، اس کے افراد بغض و عناد اور حرص کے جذبات سے مغلوب رہتے ہیں۔ وہ اپنی ناشائستہ حرکات اور

نادرست اعمال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ تو بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے بھی ان کے ساتھ یہی برتاؤ کریں۔ اس قسم کے ننگِ انسانیت افراد اگر معاشرہ کے نظام پر چھا جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ کا صالح عنصر خاموش ہو کر رہ جاتا ہے اور عام افراد ان مفسدہ پردازوں کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ فاسد رسومات کی نشر و اشاعت ان کا شیوہ بن جاتا ہے۔ اس طرح آنے والی نسلیں فاسد زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ جو لوگ معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں انہیں انسانیت کے عام مصالح کی از سر نو اشاعت کرنا پڑتی ہے اور بڑے پیمانہ پہ اشاعت کا کام انجام دینے کے بعد ان فاسد رسومات کو ختم کرنے کے لیے انہیں معاشرہ کے طاقتور افراد سے برسر پیکار ہونا پڑتا ہے۔ اس جہاد کے زمانہ میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ افرادِ معاشرہ عام انسانیت اور حکمتِ کلی پر زیادہ سے زیادہ نظر رکھیں تاکہ ان کی طبیعت میں یہ بات راسخ ہو جاتے کہ انسانیت کی فلاح اور معاشرہ کی بہبود کے خلاف ہر فعل ناجائز، فاسد اور غلط ہو جاتا ہے اور اس سے ہر فرد بشر کو دور رہنا چاہیئے۔

۲۔ معاشی عدمِ توازن

معاشی عدمِ توازن معاشرہ کے لیے سب سے بڑا روگ ہے۔ جب انسانوں کا ایک مختصر سا طبقہ ضرورت سے زائد مال و دولت کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد فاقے پر مجبور ہو جاتی ہے تو معاشرہ کو گھن لگ جاتا ہے اور اس کے افراد اپنے اجتماعی فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہتے۔ مالدار لوگوں کو دولت کی زیادتی اور محتاج طبقہ کو اس کی کمی نکما کر

دیتی ہے۔ دونوں گروہ مختلف قسم کے اخلاقی عیوب کا شکار بن جاتے ہیں اور ان کی کارگزاری بہت کم ہو جاتی ہے۔ ان دونوں طبقوں میں معاشی عدمِ مساوات کی وجہ سے وہ تعاون اور اتحادِ عمل پیدا نہیں ہو سکتا جو معاشرہ کی جان ہے۔ اس زوال آمادہ صورتِ حال سے بچنے کے لیے مصلحین معاشرہ کو کامل معاشرہ کے خصائلِ اربعہ میں سے عدالت کے اصول کو اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ جس کی روشنی میں رزق کمانے والی جماعتوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے پوری طرح احتراز کرنا ضروری ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے مختلف معاشی طبقے باقی نہ رہیں جو اپنے خصوصی مفاد کے لیے ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہوں اور ان میں ایسی کامل ہم آہنگی پیدا ہو جائے جو باہمی تعاون اور اتحادِ عمل کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ توازن صرف اس وقت قائم ہو سکتا ہے جب کسی معاشرہ میں دولت و ثروت کو تو وہ حیثیت حاصل رہے جو کبھی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ اس کی اہمیت کو اتنا کم کر دیا جائے کہ افرادِ معاشرہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ شاہ صاحب دولت اور فارغ البالی کی ایک جگہ اس طرح وضاحت فرماتے ہیں:

> اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ نظامِ معیشت میں دولت و ثروت ایک محمود شے ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسان کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا ہے، اور اس سے اُس کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لیے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس، سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ معیشت

ہیں دولت اور ثروت ایک بدترین چیز ہے جب کہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہلِ ثروت کے اطمینانِ قلب کو حریصانہ کد و کاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہے۔ اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لیے آمادہ کرتی ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ بد اخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آخرت یعنی یادِ الٰہی اور روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پروا بنا دیتی ہے اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ لہٰذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت نظامِ معیشت میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک رہے۔ یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔"

شاہ ولی اللہ صاحب نے بار بار اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دار و مدار اس کی اقتصادی زندگی کے حسنِ انتظام پر موقوف ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لیے کام کریں۔"

یہ اخلاقی تباہ حالی نتیجہ ہوتی ہے معاشی عدم توازن کا اور بعد میں اس تباہ حالی کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ افرادِ معاشرہ اپنے فطری تقاضوں اور اجتماعی اداروں کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح معاشرہ کے تمام ادارے ادبار اور زوال کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے تمدن کے زوال اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب نے

مختلف جگہ یہ بات تفصیل سے بتائی ہے کہ معاشی نظام کے فساد کی وجہ سے اخلاقی کمزوریاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"جب ایرانیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا بیٹھے اور ان پر شیطنت غالب آگئی تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے۔ جو ان کے واسطے عیش پسندی کے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامانِ عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے، قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول ہو گئے کہ اسبابِ تعیش میں کس طرح وہ دوسرے پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکا یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو، یا ان کے پاس عالی شان سربفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد و گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں۔ اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبو سے شرابِ ارغوانی چھلک رہی ہو۔ اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا

ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی ہے۔"

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش و عشرت ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا۔ اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبۂ فاسد پایا جاتا اور ان کے معاشی نظام تباہی کا باعث بن رہا تھا۔

نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ ناامیدی اور کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اس لیے کہ اپنی مفرطانہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی۔ اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لیے بادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست برد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشت کاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا۔ جو آب پاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق کچھ پیدا کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلم و بداخلاقی کی انتہا ہو گئی۔

اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اُخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لیے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اس

فاسد معاشی نظام کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یکسر متروک ہو گئیں۔ اور امراء و رؤسا کی خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بڑا حرفہ شمار ہونے لگا۔

ادھر جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی۔ اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک طبقہ جہاد کیے بغیر باپ دادا کے نام پر مجاہدین کے نام سے وظیفہ خواری کر رہا ہے تو دوسرا مدترین مملکت کے نام سے پل رہا ہے۔ کوئی بادشاہ اور امراء کی خوشامد میں قصیدہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پا رہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مال بٹور رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور درباداری کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشو و نما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست و اَرذل زندگی پہ قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دناءت سے بھر گئے اور ان کی طبائع اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاق کریمانہ کو گھن لگ گیا اور یہ سب اس فاسد نظام معاشی کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔

شاہ صاحب ایک دوسری جگہ اپنے زمانہ کی حکومتوں اور تمدنوں کے زوال پر بحث کرتے ہوئے اسی معاشی عدم توازن کو بربادی کا سبب بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

آج کل جو شہر برباد ہو رہے ہیں اس کے دو بڑے سبب ہیں۔
ناحق مال بٹورنا۔ لوگ سرکاری بیت المال کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، اور مختلف بہانوں سے روپیہ اینٹھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہم سپاہی ہیں ہمیں پنشن ملنی چاہیئے۔ ہم زمرۂ علماء سے تعلق رکھتے ہیں ہمیں کوئی جاگیر ملنی چاہیئے۔ یا وہ لوگ زاہد اور شاعر کی حیثیت سے آتے ہیں۔ جن کو صلہ دینا بادشاہوں کی عادت میں داخل ہے یا اسی قسم کے اور بہانے بناتے ہیں۔ اور بیت المال سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ بیت المال سے مشاہرہ تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس کے عوض میں کوئی کام نہیں کرتے۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث ہو جاتے ہیں اور شہر پر بار بن جاتے ہیں۔

گراں بار ٹیکس۔ شہروں کے برباد ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ حکام کاشت کاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگاتے ہیں اور ان کی وصولی کے لیے انہیں بہت تنگ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ بخوشی ٹیکس ادا کرتے ہیں اُن کا استیصال کر ڈالتے ہیں۔ اور جو لوگ سخت ہوتے ہیں وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور بغاوت اختیار کرتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ شہر قلیل ٹیکس اور ضرورت کے مطابق محافظین کار مقرر کرنے ہی سے اچھا رہ سکتا ہے۔ ہمارے زمانے کے لوگ اس نکتہ سے تنبیہہ حاصل کریں۔"

اس معاشی عدمِ توازن کو اگر فسادِ معاشرہ کے ان بنیادی اسباب

کی روشنی میں دیکھا جائے جن کا اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تو اس کے علاج کا طریقہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ یہ معاشی عدمِ توازن معاشرہ کے لیے اس لیے مُضر ہے۔ کہ اس میں معاشرہ کے ایسے اجتماعی اداروں پر اہمیت دی جانے لگتی ہے۔ جنہیں بعد میں آنا چاہیئے اور ابتدائی ضروریات کی طرف سے پہلو تہی کر لی جاتی ہے۔ آرام و آسائش کی اشیاء پیدا کرنا معاشرہ کے دوسرے درجہ کا کام ہے۔ اس کی صرف اس وقت اجازت دی جا سکتی ہے جب کہ معاشرہ میں وہ تمام چیزیں بکثرت موجود ہوں جن کی انسان کو اول درجہ کے معاشرہ میں ضرورت پیش آتی ہے اور جن کے بغیر انسان اپنی زندگی کو باقی نہیں رکھ سکتا۔ یہ اشیاء تمام افرادِ معاشرہ کی ابتدائی ضرورتوں کے لیے کافی ہونا چاہئیں۔ لیکن فاسد معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ عام افرادِ معاشرہ کے کھانے پینے کی اشیا کافی مقدار میں موجود نہیں ہوتیں اور سوسائٹی کے کام کرنے والے امراء کے لیے سامانِ عیش تیار کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ ایک دوسری بنیادی خرابی اس معاشی عدمِ توازن کے وقت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ معاشرہ کے بہت سے افراد ایسے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ جو انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے اور ایسے کام کرنے والوں کی تعداد کم رہ جاتی ہے۔ جن کے ذریعہ انسان کی ابتدائی ضرورتوں کے لیے سامانِ تسکین فراہم کیا جاتا ہے۔ اس معاشی عدمِ توازن والے معاشرہ میں ایسے لوگوں کی بھی بہت بڑی تعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ جو کسی قسم کا کوئی کام نہیں کرتے اور ہر وقت عیش کرنے اور رنگ رلیاں منانے میں مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ اپنے مقاصد کی طرف سے بالکل رُوگرداں ہو جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ پر تنزل اور ادبار کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

دس ہزار آدمیوں کی ایک بستی ہے۔ اگر اس کا اکثر حصہ نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف نہیں رہتا۔ تو وہ ہلاک ہو جائے گی۔ ایسے اگر ان کا بڑا حصہ تعیش میں مبتلا ہو گیا تو قوم کے لیے بار بن جائے گا۔ جس کا ضرر بتدریج ساری آبادی میں پھیل جائے گا۔ اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی جیسے انہیں دیوانے کتے نے کاٹ کھایا ہے۔"

شاہ صاحب نے جہاں کسی معاشرہ کی اس زوال پذیر حالت کا ذکر کیا ہے تو وہ اسے انقلاب کا پیش خیمہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب کبھی انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو خدا تعالیٰ انسانیت کو اس سے نجات دینے کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکالتا ہے۔ اس قسم کی حالت تھی جب قرآن نے دنیا کو انقلاب کی دعوت دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کا انقلاب ایسے زمانہ میں ہمیشہ آتا ہے۔ ان حالات سے پریشان ہو کر ایک ایسا گروہ اٹھتا ہے جو معاشرہ کو اس بدنظمی سے پاک کرنا چاہتا ہے اور جو یہ چاہتا ہے کہ معاشرہ میں معاشی توازن کی عمل داری رائج ہو جائے۔ یہ گروہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ معاشرہ کے تمام افراد پیدائش دولت کے فرائض انجام دیں۔ اور اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ سب سے پہلے صرف وہ چیزیں پیدا کی جائیں جن سے تمام افراد معاشرہ اپنی ابتدائی ضرورتوں کو پورا کر لیں۔ اس کے بعد اس کی اجازت دی جاتی ہے کہ لوگ ایسے کام کریں جو انسانیت کے لیے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں۔ مصلحین کی یہ جماعت کامل معاشرہ کے تصور، اس کے مقاصد اور اس کی تاریخ ارتقاء اپنے سامنے رکھتی ہے اور ان سب کی روشنی میں ایک صالح معاشرہ پیدا کرتی ہے۔ اس معاشرہ میں افراد کی معاشی زندگی باہمی تعاون اور اشتراک پر مبنی ہوتی ہے۔

ہر فرد پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ معاشی زندگی میں اشتراک اور تعاون سے کام لے۔ کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ معاشی امور سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اس معاشرہ میں اس کی اجازت ضرور ہوتی ہے کہ ہر فرد ذرائع دولت کے بعض حصوں کو اپنے قبضہ میں لے کر پیدائش دولت کا کام انجام دے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایسا کرنے سے وہ کسی دوسرے فرد کے لیے معاشی ذرائع کی تنگی کا باعث نہ بن جائے۔ اگر کوئی شخص ذرائع دولت کو اس طرح قبضہ لے کر اس کی وجہ سے معاشرہ کے بعض افراد اپنے فطری تقاضے پورا نہ کر سکیں تو معاشرہ کے مصلحین اس صورتِ حال کو بدل دیتے ہیں۔

۳۔ جرائم

عام طور سے جرم ملک کے مروجہ قانون کی خلاف ورزی کو کہتے ہیں۔ عمرانیات کی اصطلاح میں وہ فعل جس سے معاشرے کو شدید نقصان پہنچے جرم کہلائے گا۔ خواہ اس وقت قانون نے اسے جرم نہ قرار دیا ہو۔ قانون حکومت بناتی ہے، اس لیے قانون کی خلاف ورزی کی روک تھام اور جرائم کا سدِ باب بھی حکومت کا فرض ہے۔ اوپر معاشرہ کے جو امراض بیان کیے گئے وہ افرادِ معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ جرائم بھی اگرچہ معاشرہ اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اکثر معاشرتی ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا براہِ راست تعلق افراد سے ہوتا ہے اور ان کی روک تھام کرنے کے لیے حکومت کو مجرمین کی انفرادی طور پر نگرانی کرنا پڑتی ہے اس لیے اس مرض کو علیحدہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحب نے اعضاء حکومت اور ان کے وظائف کی تشریح کرتے ہوئے "سبد و رباز غنہ" میں افرادِ معاشرہ کے ایسے افعال کی تفصیل بیان کی ہے

جو معاشرہ کے لیے شدید نقصان کا باعث ہوتے ہیں اور جن کا انسداد حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ شاہ صاحب نے ان جرائم کی سات قسمیں کی ہیں۔ لیکن یہاں ان کی تعداد صرف چھ کر کے دکھائی گئی ہے۔ ان چھ جرائم کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ وہ افعال جن سے افرادِ معاشرہ کی ذات کو نقصان پہنچے مثلاً مار پیٹ اور قتل اور زہر دینا وغیرہ۔

۲۔ وہ افعال جن سے افرادِ معاشرہ کو مالی نقصان پہنچے یا ان کے حقوق ملکیت میں دست اندازی ہو، مثلاً دوسرے کا مال غصب کرنا۔ سرقہ اور ڈاکہ زنی۔

۳۔ وہ افعال جن سے افراد کے ذاتی حقوق میں دست اندازی ہو مثلاً جھوٹی تہمتیں اور بہتان لگانا۔ اور کسی کو بدنام کرنا۔

۴۔ وہ افعال جو انسان کی فطرت کے خلاف ہوں اور جن کے رواج سے معاشرہ فساد کا گہوارہ بن جائے مثلاً زنا، لواطت، شراب نوشی اور قمار و ربوٰا یا مردوں کا عورتوں کی صفات اختیار کرنا اور عورتوں کا مردوں کی۔

۵۔ وہ افعال جو معاشرہ میں ایسا فساد پیدا کرتے ہیں جو آنکھوں سے پوشیدہ رہتا ہے لیکن در پردہ معاشرہ کے جسم کے لیے روگ بن جاتا ہے جیسے جادو اور ٹونکے کا رواج، سٹہ کی تجارت، چالاک اور چال باز مفتیوں کا عوام کو حیلے اور جھگڑے کی باتیں سکھانا۔

۶۔ وہ افعال جو فسادِ انسانیت کا سبب ہوں اور جن سے امن عامہ میں خلل پڑتا ہو۔ مثلاً دین و مذہب میں تفرقہ اندازی، فسادِ معاشرہ کا بہت بڑا سبب ہے۔ اس کی روک تھام ضروری ہے۔ اگر کسی دین و مذہب میں مختلف فرقے پیدا ہو جائیں تو باہمی منازعات اور لڑائیوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ ان فرقوں میں سے اکثر

باطل اور غلط باتوں کی تعلیم دیتے ہیں جس سے انسانوں کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جاتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب ان جرائم کی روک تھام کے لیے ایک طرف تو یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ ان کے اسباب معلوم کیے جائیں۔ اگر ان کا سبب معاشرتی ماحول کی بعض خرابیاں اور مجرمین کی غلط تربیت ہے۔ تو اس کا معقول انتظام کیا جائے کہ آئندہ ان اسباب کی بنا پر جرائم پیشہ لوگ پیدا نہ ہونے پائیں، دوسری طرف وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جرائم پیشہ افراد کو ان کی مفسد حرکات سے روکنے کے لیے سزائیں بھی دینا ضروری ہیں۔ یہ سزائیں ان کے افعال کی مضرت کی کمی بیشی کو سامنے رکھ کر دینا چاہئیں۔ شاہ صاحب نے متعدد جگہ اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ سزائیں دینے کا طرز عمل ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کے ذریعہ مجرمین سے انتقام لیا جا رہا ہے۔ سزائیں معاشرہ کو فساد سے بچانے اور مجرمین کی اصلاح کی خاطر رواج پاتی ہیں۔ معاشرہ میں یہ طرز عمل اس وقت ہی پیدا ہو سکتا ہے جب کہ حاکمہ قوت تمام افراد معاشرہ کو اپنے برابر درجہ دے اور ان کے لیے ان تمام بھلائیوں اور اچھائیوں کی خواہش مند ہو، جنھیں وہ اپنے لیے پسند کرتی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے اجتماعی مباحث میں بار بار یہ بتایا ہے کہ اگر اس طرح کامل معاشرے کے تصور کو سامنے رکھ کر اجتماعی امراض کی اصلاح کی جاتی رہے تو معاشرہ ارتقاء کے منازل طے کرتا رہتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے ان عمرانی نظریات کی بنیاد پر اپنے عہد کی دم توڑتی ہوئی انسانیت کے لیے جو لائحہ عمل پیش کیا تھا وہ اس مصیبت زدہ دنیا کے لیے آج بھی باعث صد رحمت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کی شاہ صاحب کی اس حکمت

کے متعلق یہ بہت صحیح رائے ہے جس سے انکار کرنا بہت مشکل ہے۔

"الغرض شاہ صاحب کی اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ ان کا نظام اتنا جامع عالمگیر اور ہمہ گیر ہے کہ وہ انسان کی ابتدائی ضروریات سے جنہیں ہم حیوانی زندگی کے لوازم کہتے ہیں، لے کر انسانیت کی ترقی کی آخری اور ارفع ترین منزل تک جتنے ارتقائی مراحل اور مقامات ہیں، ان سب کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔ اب اگر اس نظامِ فکر کا اساس نبوت کو مان لیا جائے اور جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے پیروؤں میں سے صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس تشریح کے بعد نبوت انسانیت کے لیے کس قدر فطری چیز بن جاتی ہے اور جیسا کہ عام طور پر غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبوت کا کام صرف اس زندگی کے بعد کے مسائل کو ہی حل کرنا تھا۔ اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے اور پھر نبوت کی تعلیم صحیح معنوں میں "حَسَنَۃً فِی الدُّنْیَا" اور "حَسَنَۃً فِی الآخرۃ" کی حامل بن جاتی ہے۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ)

—— ❊ ——

کتابت: سلطان احمد ۱۹۶۷ء

خطبات و مقالات

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم

مرتبہ : پروفیسر محمد سرور

یہ خطبات و مقالات نتیجہ فکر ہیں ایک ایسی نادرالوجود شخصیت کے جس کو قدرت نے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کی تھیں۔

پچیس سال کی جلا وطنی کے بعد مولانا مرحوم جب وطن واپس لوٹے تو ان خطبات و مقالات کی صورت میں اپنا پیغام سنایا۔ مرتب نے ایک مبسوط مقدمے میں مولانا مرحوم کے اس پیغام کے تاریخی پس منظر کی وضاحت کی ہے۔

سندھ ساگر اکادمی - لاہور

پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸۵